TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL LIBRARY

OU_222417

UNIVERSAL LIBRARY

جہانِ آرزو

غزلوں کا مجموعہ

آرزو لکھنوی

نفیس اکیڈیمی
عابد روڈ حیدرآباد دکن

دو روپیہ بارہ آنہ کلدار
تین روپیہ چار آنہ حالی

۱۴۶۹۴ء

چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری
پروپرائٹر نفیس اکیڈیمی عابد روڈ حیدرآباد دکن

طبع دوم
جنوری ۱۹۴۶ء

مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

عرضِ مدعا

خدا کی عنایت اور احباب کی پُرخلوص محبت سے میری غزلوں کا ایک اور مجموعہ "جہانِ آرزو" کے نام سے چھپ کر تیار ہوگیا اب دوستوں کی یہ ضد ہے میں نفسِ شاعری کے متعلق بھی اپنے خیالات قلم بند کردوں جو بطورِ دیباچہ کے شامل کرکے دیوان کے ساتھ شائع کردیئے جائیں۔

خدا ہی جانے شاعری کیا چیز ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک ہر زمانے اور ہر مقام کے اہلِ فکر اس عقدے کو حل کرتے چلے آئے مگر وہ اسی طرح لاحل نظر آ رہا ہے۔ ایک ہی مبحث میں متضاد خیالات کا اجتماع کسی خاص نتیجہ تک پہنچنے نہیں دیتا۔ یوں تو جس سے جس طرح حل کرتے بنا خود اُس کے لئے یا اس کے تابعین کے لئے وہ حقیقی حل ہوگیا۔ لیکن یہ گتھی ایسی کبھی نہ سُلجھ سکی

جس کے بعد بحث تمام ہو جاتی اور اس کے قبول کر لینے سے کسی کو انکار نہ ہوتا، یا پھر کچھ لکھنے کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوا کہ میں نقلِ اقوال کی بے سود کوشش سے باز رہوں اور تحصیلِ حاصل کی بدعت کو ترک کر کے جو کچھ اپنی سمجھ میں آیا ہو اسی کے اظہار پر اکتفا کروں۔ اور اس سے بحث نہ رکھوں کہ میرا مسلک دوسروں کے لئے قابلِ تقلید ہوگا یا لائقِ تردید مگر اس کا اتنا فائدہ ضرور ہے کہ نقادوں کو میری روش معلوم کرنے کے لئے ایک راستہ اور میرا کلام جانچنے کے لئے ایک معیار ہاتھ آ جائے گا۔

آرزو

شاعری

کلام میں استعمالِ کلمات کا ایسا سلیقہ جس سے مفہوم میں تاثیر اور الفاظ میں ترنم پیدا ہو جائے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کلام تو نثر و نظم میں عام ہے مگر اسے تعریفِ شعر میں لانے والی دو ہی چیزیں ہیں :-

(۱) مفہوم کی تاثیر۔ (۲) الفاظ کا ترنم

اور چونکہ ترنم خود بھی تاثیر کا حامل ہوا کرتا ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ معنی سے تاثیر پیدا ہو یا لفظ سے، شاعری کی بنیاد اثر آفرینی ہی پر ہے۔ یہی روحِ شعر ہے یہی غایتِ شعر اور یہی شعر و غیر شعر میں شئے امتیازی، جو شاعر کو ساحر بنا دیتی ہے۔

مفہوم کی تاثیر

مفہوم کی تاثیر سے وہ اثر مراد نہیں جو نفسِ مطلب میں پہلے سے موجود ہو جیسا کہ مژدہ مسرّت یا حکایتِ غم میں ہوا کرتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ اثر آفرینی ہے جسے بات میں بات پیدا کرنا کہتے ہیں اسی کا مشہور نام مضمون ہے اور یہی شاعر کی ذاتی ملکیت ہے جس کا لے لینا چوری میں داخل ہے۔

قدرت نے جن فطرتوں میں اس کا مادہ ودلیعت کر دیا ہے وہ ایسے ایسے نکتے اختراع کرتی ہیں جن سے معمولی بات میں اہمیّت اور بے اثر بات میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک طرح کا الہام ہے جو اکتساب سے حاصل نہیں ہوتا۔

الفاظ کا ترنّم

شعر میں الفاظ کے ترنم سے بھی موسیقی کا ترنم مراد نہیں جس میں مغنّی آواز کے درجوں سے "سُر" اور سُروں کی ترتیب سے راگ کی شکل قائم کرتا ہے بلکہ اس سے مراد مختلف حروف کی وہ اجتماعی آواز ہے جو بغیر لکنت کے روانی کے ساتھ زبان سے نکلے اور لفظوں کا وہ توازن جو اوزانِ عروضی کے مطابق ہو عام اس سے کہ وہ اوزان قدیم ہوں یا جدید مگر ہوں ایسے جنھیں ذوق اُو باد وزن تسلیم کرلے۔

اب یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ لفظ ومعنی کا ذاتی اثر کلام کو تعریف شعر میں نہیں لاسکتا، بلکہ جب شاعرانہ الہام اور ادبی سلیقہ اس میں کارفرما ہوکر ایک دوسری تاثیر پیدا کر دیتا ہے اُس وقت وہ شعر سمجھا جاتا ہے مگر شاعرانہ الہام کے تمام محاسن بجائے خود گونگے بلکہ کالعدم ہیں۔ ان کے اظہار کا واحد ذریعہ استعمال الفاظ کا سلیقہ ہی ہے۔ اس لئے شاعری میں کلمہ وکلام ہی کی بحث کو زیادہ اہمیت ہے۔ قادرالکلام وہی شاعر

ہوسکتا ہے جیسے لغات زبان پر عبور، انتخاب الفاظ میں شعور اور ترتیب الفاظ سے اسالیب بیان اختراع کرنے کا پورا سلیقہ ہو ورنہ دل کی بات دل ہی میں رہ جائے گی، یا کہنا کچھ چاہے گا اور منھ سے کچھ نکلے گا۔ یوں تو اپنا مطلب ایک گونگا بھی اشارہ کرکے سمجھا دیتا ہے۔ مگر شاعر کی بات کو شعر کے الفاظ اور بیان کے انداز ہی سمجھا سکتے ہیں اور جو شعر اس صفت سے خالی ہو وہ ناقص ہے۔

اس تحقیق و تشریح کے بعد اگر شاعری کے عناصر تعمیری کو نظر میں رکھکر ذرا واضح طور پر تعریف کی جائے گی تو یہ ہوگی

"کسی قابل اظہار خیال کو مناسب حال الفاظ میں انداز خاص سے

موزوں کرنے کا نام شاعری ہے اور صورت حاصلہ کا نام شعر ہے۔"

اب اس بحث میں چار چیزیں سامنے آتی ہیں خیال[1]، الفاظ[2]، انداز بیان[3] وزن عروضی[4]۔

پہلا عنصر "خیال" خیال کا تعلق واقعات عالم سے ہو یا واردات قلب سے یا کائنات کی کسی چیز سے اس کا قابل اظہار ہونا ضروری ہے کیونکہ ہر خیال قابل اظہار نہیں ہوتا۔ یہ بحث بہت طویل ہے جس کی اس مختصر سے دیباچہ میں گنجائش نہیں لہذا میں چند مثالوں پر اسے ختم کردوں گا۔

(۱) وہ خیال جس کا نتیجہ تحصیل حاصل ہو (یعنی کہی ہوئی بات بغیر کسی

تازگی کے کہنا) ہیچ ہے۔

(۲) وہ بات جس کے کہنے سے نہ کوئی فائدہ حاصل ہو نہ لذت' کہنے کی نہیں۔

(۳) وہ بات کہ خلاف عقل ہو۔

یہ چند اشارے نفسِ مطلب سمجھ لینے کو کافی ہیں۔

دوسرا عنصر "الفاظ" جو الفاظ اظہار خیال کے لئے اختیار کئے جائیں وہ مناسب حال ہوں تاکہ خیال اپنی تمام لطافتوں کے ساتھ مکمل طور پر ادا ہو جائے۔

تیسرا عنصر "انداز بیان" لفظوں کی نشست کا ایسا سلیقہ جو اظہار معنی کے ساتھ خیالات کی تمام لطافتوں کو ظاہر کرنے کا ضامن ہو اور خود بھی کسی دلکشی کا حامل ہو۔

چوتھا عنصر "وزنِ عروضی" کلام کے لئے اس کا موزوں ہونا بھی ضروری ہے کہ یہی چیز اپنے امتیاز خاص سے نثر کو اس کی شان بڑھا کر تعریف شعر میں لے آتی ہے۔ لیکن وزنِ عروضی کا مبحث اختلافی ہے بعض اہل فن اسے نفسِ شعر سے خارج بتاتے ہیں اور بعض اہل ذوق اسے شعر کا جزو ذات مانتے ہیں۔ میں قولِ اول کے مؤیدین سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ نثر کے پر تاثیر ٹکڑے کو شعر' یا بے اثر موزوں کلام کو نثر کہیں گے

تجربہ تو اس کے خلاف شہادت دیتا ہے۔ علاوہ اس کے شعر اثر کا حامل ہو یا نہ ہو وزن عروضی کا ترنم اُسے اپنے اثر سے کھینچ کر اُسے تعریف شعر میں لے آتا ہے مگر نثر میں وہ کونسی شے ہے جو اُسے کھینچ تان کر تعریف شعر میں لائے گی۔ کیونکہ تخیُّل دونوں صنفوں "نظم و نثر" میں جزو مشترک ہے جو ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی مجھے تو یہاں تک کہنے میں بھی جھجک نہیں کہ "کلام مخیل موزوں" کو شعر کہنا بھی ایک ذہنی بات ہے جو اہل فن کو قلم اُٹھاتے وقت یاد آتی ہے یا مباحثہ کے وقت پیش ہو جاتی مگر جب وہ خاص وقت گزر جاتا ہے تو لفظِ شعر کا مفہوم کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔ خواص ہوں یا عوام کلام منظوم کے اُس جزو قلیل کو دو ٹکڑے کرکے پڑھا جاتا ہے۔ شعر کہتے ہیں جس کے لئے مساوی الوزن اور مربوط بمعنے ہونا ضروری ہے مگر مخیل ہونا ضروری نہیں۔ اس اختلاف قول و عمل کو دیکھتے ہوئے اگر دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھا جائے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ کلام موزوں مجازاً شعر ہے اور کلام مخیل موزوں حقیقتاً شعر ہے۔

بعض اہل تحقیق جو انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ شعر و نظم سے کرکے کلامِ مخیل کو شعر اور غیر مخیل کو نظم سے تعبیر کرتے ہیں یہ حقیقت بھی قضیہ زمین برسر زمین کے مطابق نہیں۔ انگریزی لفظوں کا اس زبان کے اعتبار سے جو

کچھ مفہوم ہو اور وہ لفظیں نفس مطلب کی پوری ترجمان ہوں یا نہوں اسے انگریزی داں صاحب جانیں۔ اُردو میں شعر کا کیا مفہوم ہے؟ وہ میں بیان ہی کر چکا اب نظم کا مفہوم بھی سمجھ لیجئے۔

نظم کا قدیم مفہوم بھی کلام موزوں ہے جس میں مخیل اور غیر مخیل دونوں داخل ہیں اور جدید مفہوم بھی ذرا سے فرق کے ساتھ وہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آج کل یا تو اس صنفِ سخن کو نظم کہتے ہیں جو کسی صنف میں نہ ہو یعنی تمام اصنافِ سخن قصیدہ، قطع، غزل، رباعی، مثنوی، مخمس، مسدس وغیرہ میں سے کسی صنف کی تعریف میں نہ آتی ہو یا کسی خاص موضوع پر تسلسل بیان کے ساتھ تصنیف کی گئی ہو۔ لہذا جب اس کے لئے پہلے سے کوئی اصطلاحی نام موجود نہیں نہ اب اختراع ہوا ہے تو موزوں ہونے کے لحاظ سے اُسے نظم نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔ یہی حالت قافیہ کی ہے کہ اسے بھی بعض اہل فن شعر کا جزو ذات مانتے ہیں اور بعض نہیں مانتے ہیں۔ محقق علامہ نصیرالدین طوسی علیہ الرحمہ قافیہ کی صناعات شعری سے شمار کرتے ہیں۔ یہ ایک حد تک ٹھیک ہے مگر اچھی طرح واضح نہیں۔

اس مبحث پر زیادہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعرا نے اصنافِ سخن کی بنیاد قافیہ ہی پر رکھی ہے قصیدہ، مثنوی، رباعی،

مسمط وغیرہ کا فرق قافیہ ہی کے ذریعہ محسوس ہوتا ہے۔ اگر قافیہ تمام اصناف سخن سے علیحدہ کر دیا جائے اور بنائے شعر صرف وزن عروضی پر رہنے دی جائے تو "نظم" نثر مرجز بن کے رہ جائے گی۔ اور سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور وزن کی قید بھی اٹھا دی جائے تو پھر کیا رہ جائے گا۔ نثر کی نثر اور خدا کا نام، لہٰذا شعر کے لئے جس طرح وزن عروضی اس کا جزو لازم ہے اسی طرح سخن میں اس کے اصناف قائم کرنے کے لیے قافیہ جزو بنیادی اور ہر صنف کو شناخت کرنے کے لئے جزو امتیازی ہے۔

میری رائے میں یہ تھی حقیقت شاعری کی جسے اپنی عادت کے موافق مختصر لفظوں میں مگر مدلل طور پر بیان کر دیا۔ میں کورانہ تقلید کے گھوڑے پر بیٹھ کر سائنس کی لمبی ڈوری کے سہارے حد معین کے اندر کاوے لگاتے رہنے سے کوسوں دور بھاگتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ بھی انیلے سوار کی شان ہے شہسوار کی شان نہیں۔

اب میں اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں اگر حیات نے ساتھ دیا اور مکروہات نے تھوڑے عرصہ کے لئے بھی ساتھ چھوڑا تو انشاء اللہ اس اجمال کو ذرا اور تفصیل کے ساتھ مع مفید معلومات علیحدہ کتاب کی صورت میں پیش کروں گا۔ والسلام

ناچیز
سید انور حسین آرزو لکھنوی

مکتوبہ احمد نسیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مناجات

اللہ اللہ شانِ ذاتِ لایزال | جس کے مستقبل میں ہیں ماضی و حال
پردۂ جلوت نمائے کائنات | ہے طلسم مظہرِ ذات و صفات
خیرہ در ماندہ چشمِ انتخاب | اک حجاب اندر حجاب اندر حجاب
نام کیا لیں اور گُن کس طرح گائیں | معنیِ بے لفظ کو کیوں کر بتائیں
شکر اے بخشندۂ عقل و شعور | تجھ سے اپنے کو بہت پاتا ہوں دور
یہ کہاں سے کس جگہ میں آ گیا | کون سے لالچ میں دھوکا کھا گیا
اک نفس سے بن گئی ساری نمود | نیستی سے بھی زبوں ہے ہست و بود
تودۂ نفریں بنا ہوں سر بسر | اپنے سے کارہ ہے خود اپنی نظر

ذکر میں جس کے زبانِ نطق لال
خود غمِ ناگفتنی ہے شرحِ حال

میں اور میــــرا کریم

آرزو اک بے بضاعت آدمی — جس کا کل سرمایہ اک لائے نفی[۱]
دوسروں کے حق میں بے روغن چراغ — اور خود اپنے لیئے خالی ایاغ

۱؎ یہ لفظ ساکن الاوسط ہے۔ میں نے اِسے جن وجوہ کی بنا پر ساکن الآخر لانا اور پھر اضافت فارسی کے ساتھ استعمال کرنا جائز جانا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اُردو بولنے والوں کے لہجہ میں یہ ساکن الآخر ہے متقدمین نے نشہ وغیرہ کے استعمال میں اس اعتبار کو ہر جگہ دخل دیا ہے اور وفا کے قافیہ نشۂ نظم کر گئے ہیں وہ جاہل نہ تھے اور نہ میں اس لفظ کی حقیقت سے بے خبر ہوں وہ عربی کے لئے ساکن الاوسط صحیح و فصیح ہے مگر اُردو کے لئے ساکن الآخر ہی صحیح بھی ہے اور فصیح بھی خاص کر آخر کلام میں۔

(۲) ختم کلام حرف متحرک پر محال ہے اس لیے آخر لفظ اگر ساکن الآخر نہیں ہوتا تو ساکن کر لیا جاتا ہے اسی مقصد سے فارسی کے متحرک الآخر الفاظ میں ہائے مختفیہ بڑھا دیتے ہیں کہ حرکت آخــر حرف ساکن کے موجود ہونے سے کھنچ کر اک حرف کی آواز پیدا کر دیتی ہے جیسے "ہمہ درمہ" مشہور لفظیں ہیں۔

(۳) صرف حرکت و سکون کی تبدیلی ایسی چیز نہیں جس سے لفظ اصل سے دور ہو کر مثل "ماخوذ" اور "صابن" کے سند مان لیا جائے لہذا اس میں اضافت فارسی کا لانا بھی غلط نہیں ہو سکتا ہاں ترکیب عربی ہوتی تو درست نہ سمجھی جاتی۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے میں دوســروں کو اس طرز عمل پر مجبور نہیں کرتا۔ آرزو

اپنا ہی حامی نہ اوروں کا کفیل
قید میں جیسے زرِ مشتِ بخیل

شاق نظروں کو' دوں پر بھی گراں
صورتِ کفّار ہائے عاصیاں

خلق میں ننگ آفریں جس کی نمود
ایک اندھا آئینہ جس کا وجود

نفس جس کا موجبِ تخریب کار
ہوش جس کا بیخودی کی یادگار

پست ہمت دانش و حکمت سے دور
اپنی محرومی میں خود اپنا قصور

ہر تمنا جس کی ناجائز ہوس
خواہشِ نعمات اور بے پر مگس

ننگِ ہستی غاصبِ نامِ بشر
قطرۂ آبِ ندامت سر بسر

کم سے کم بھی نام جس کو عینِ جاہ
کفش کو جیسے کوئی کہہ دے کلاہ

وہ ترا بارانِ رحمت بے شمار
وہ مرا کفرانِ نعمت بار بار!

یوں بگاڑے آپ اپنے بنتے کام
کوئی پیاسا جیسے خود ڈھلکا دے جام

کر سکا حاصل نہ دنیا اور نہ دین
ہوں کہیں کیوں جب کہیں کا بھی نہیں

ہیں مری فردِ عمل شام و پگاہ
اک ورق سادہ سراسر اک سیاہ

دردمند و دل حزین و دل فگار
زندگانی مثلِ نبضِ بے قرار

کس لیے ہوں کون ہوں اور کیا ہوں میں
کہہ نہیں سکتا تو کیوں گویا ہوں میں

ہستیِ ناکارہ کا ہے سود کیا
رمز اپنے تو ہی جانے اے خدا

جس سے سب اعلیٰ ہیں وہ ادنیٰ ہوں میں
ہوں جو کچھ پھر بھی ترا بندہ ہوں میں

کیوں یہ میں پوچھوں کہ کیوں پیدا کیا
تیری مرضی، جو کیا اچھا کیا

میں ذلیلوں سے ذلیل اور تو جلیل
میں کفالت خواہِ بے حق تو کفیل

اب رہی اک دہشتِ انجامِ کار
وہ بھی کیوں ہو جب ہے تو آمرزگار

میں نہیں ہوں کوئی بے صاحب غلام
صاحب ایسا۔ جس کا ہے غفّار نام

مستحقِ عفو کیوں عصیاں نہیں
عبدِ بے ہمّت ہوں نافرماں نہیں

کیوں یہ سمجھوں کون تو اور کیا ہوں میں
ہر طرح تو میرا اور تیرا ہوں میں

اپنی افراطِ کرم پر کر نگاہ
ایسے کتنے ہیں مرے جرم و گناہ

لائقِ الزام کب ہے درگزر
مجکو ڈر تیرا ہے۔ تجکو کس کا ڈر

اس جگہ ہے ظلم نا انصاف کا
ہے خدا بندہ، نہ بندہ ہے خدا

آج اگر کھولا ہے بازارِ نشور
کرکے قائم قیمتِ جور و قصور

کچھ نہ ہو۔ پھر بھی غنی ہوں لاکلام
سب خزانوں سے بڑا ہے تیرا نام

ناز ہے بیجا مجھے اے بے نیاز
آج تک محمود تو ہے، میں ایاز

جو کرم ابتک ہے پھر ہوگا نہ کیوں
بے خرد پر تہمتِ فرزانہ کیوں

اک عمل بھی نیک جب ہوتا نہ تھا
جو دیا ابتک یہ تھا کس کا صلا

بگڑی عادت اب کوئی کیوں کر بنائے
ناز تو میں نے کئے تو نے اُٹھائے

خو بدل کر جائزہ لینا، یہ کیا
ناز پروردہ کو دکھ دینا، یہ کیا

کیسی پرسش، کیا عمل، کس کا صلا
آج یہ کیا ہے۔ ابھی کل تک تھا کیا

تیرا ہو کر، غم سہے، ایذا اُٹھائے
جب ہے جنت بھی تو کیوں دوزخ میں جائے

۔ پست مجھ سا گر نہ ہوگا سرفراز
کس کی بخشش پر کرے گا رحم ناز

میرے حق میں تیرا دامن کیا نہیں
پاک دامان شفیع المذنبیںؐ

آتش دوزخ سے کیا نسبت رہی
جبکہ عصیاں سوز ہے حُبّ علیؑ

ڈر سے جب کانپے گا میرا تن بدن
آسرا دے گا نہ کیا خُلقِ حسنؑ

جب اُسی مظلوم پر ہے سب کا دین
میرا ضامن کیا نہیں خُونِ حسینؑ

اشکِ غم میرے ملک جب لائینگے
شعلے دوزخ کے بھی تھرا جائینگے!

الغرض حامی سبھی ہیں بالیقین
احمد مرسل سے تا مہدیِ دین

اور یہ سب پیارے تجھے واللہ ہیں
یہ ہیں اک چودہ شفاعت خواہ ہیں

یہ وسیلے اور ترا جوشِ کرم
بہ کے تا کوثر پہنچ جائیں گے ہم

شاعر

آرزو ہے واقفِ رازِ سخن
نغمہ آگیں جس کا ہر سازِ سخن

پوچھ یہ اُس سے کہ کس قابل ہے کون
کون ناقص شاعرِ کامل ہے کون

ہے وہ کیا جس کا سخن ہو چیستاں
ہے وہ کیا کج مج رہے جس کا بیاں

کچھ نہیں جو اتنا بے قابو رہے
منہ سے کچھ نکلے زباں سے کچھ کہے

بحث نا اہلوں سے تو اس جا نہیں
شاعری کچھ کھیل لڑکوں کا نہیں

منظرِ حیرت ہیں شاعر کے صفات
دن کو جب چاہے دکھا دے کر کے رات

لے اگر کچھ فکر کی کاوش سے کام
ایک ہو گردوں کا خرق و التیام

گر کبھی بادل کا ٹکڑا نا دکھائے
آنکھ میں بجلی ہے بجلی کو نہ بھائے

گر دکھائے عشق کی سرمستیاں
حسن بھی لینے لگے انگڑائیاں

دیس کا کھینچے سماں پردیس میں
اصل کر دے نقل کو ہر بھیس میں

صاحبِ احساس اسرارِ نہاں
جنبشِ لب شمعِ کشتہ کی زباں

ہو ممیز اقتضائے حال کا !
ہے محل تفصیل یا اجمال کا

لفظ و معنی میں ہو وہ نسبت بہم
رنگ ہلکا ہو نہ بوے خوش ہو کم

پیش جس کے غم کا آئینہ کرے
درد مند اپنی زباں سمجھے اسے

الغرض جو کچھ کہے وہ یوں کہے
دل میں دل جس طرح کوئی ڈال دے

جس حقیقت کو نہ پہنچے فلسفی
بن کے ظاہر ہو لطافت شعر کی

جس کے حل میں گنگ منطق کی زباں
اُس کو پانی کر دے شاعر کا بیاں

کیف وہ لفظوں میں ہو بے بیش و کم
جس جگہ ٹوٹے مصوّر کا قلم

معجزہ اور پھر نہیں اعجاز بھی
آشکارا بھی ہو اور راز بھی

کیا مسمّط کیا غزل کیا مثنوی
قدرتِ شاعر میں ہیں سب ایک ہی

چاہے پیمانہ کا میخانہ بنائے
چاہے میخانہ کو پیمانہ میں لائے

ہو غرض جس طرح کا ردّ و بدل
اک سہانی رُت ہو ہر طرزِ عمل

نام گنوانے سے کچھ حاصل نہیں
اہلِ بینش کو پرکھ مشکل نہیں

ہے یہ شاعر جیسے صاحبدل کا کام
جیسی سیرت ویسا شاعر کا کلام

جو سخن ہو اک نیا پیغام ہو
ورنہ تو ممکن نہیں الہام ہو

اس جگہ باطل ہے سحرِ سامری
شاعری جزویست از پیغمبری

غزل

سُن لے اے ناواقفِ رازِ غزل
رکھتا ہے اسرار کیا سازِ غزل

ظاہراً اک صنف ہے محدود سی
جس سے ہیں منسوب عشق و عاشقی

باطناً دنیائے لامحدود ہے
کل کا کل اس جزو میں موجود ہے

تنگ ہے وسعت سے جس کی ہر مکاں
جس کے دو مصرعے[1] ہیں گویا دو جہاں

ہے غزل ہی شاہراہِ شاعری
ہے غزل ہی درسگاہ شاعری

ہے یہی اول یہی آخر سبق
دفترِ کُل ہیں اسی کے دو ورق

ایک مصرع ہے زمیں اک آسماں
قید جس کے دائرے میں کن فکاں

جلوہ افروزِ جمالِ فن ہے یہ
امتحاں گاہِ کمالِ فن ہے یہ

تہ جو اس کے فرد کی بھی پا گیا
جملہ اصنافِ سخن پر چھا گیا

---

[1] مصرع کی جمع فتح را کو کسری سے بدل کر بنائی جاتی ہے۔ مصرع کے آخر میں یائے مجہول بڑھا کے (مصرعے) بولنا یا لکھنا زبان کے قواعد حقیقی سے بیخبر ہونے پر دال ہے ۱۲ آرزو

گر غزل گو طبع کی گرمی دکھائے — ہر شرارہ برق کا دامن جلائے
ایک قطرہ میں سمائے آبشار — ایک گل دکھلائے گلشن کی بہار
نظم سے درجہ غزل کا کر کے کم — کھوتا ہے ناداں کیوں اپنا بھرم
یوں ہے بے مشقِ غزل ہر شاعری — جیسے بے ناز و کرشمہ دلبری
کچھ جو بے کیفی سے موزوں کر لیا — جام مل پانی سے جیسے بھر لیا
ہے اگر حاصل غزل میں دستگاہ — سامنے ہے ہر سخن کی شاہراہ
جڑتے ہی بکھرے خیالوں کی کڑی — نظم بن جاتی ہے موتی کی لڑی
دن کو مثلِ شپرہ ہے محوِ خواب — آنکھ خیرہ ہے کہ تیرہ آفتاب
ہیں نظر میں تیری جو نجمِ فلک — ہے انھی خورشید کی ان میں جھلک

گل جو ہو جائے غزل ہی کا چراغ
سب ستارے بن کے رہ جائیں گے داغ

(۱)

آگئی منزلِ مراد ۔۔۔ بانگِ دراکو بھول جا
ذاتِ خدا میں یوں ہو محو ۔۔۔ نامِ خدا کو بھول جا
سب کی پسند الگ الگ ۔۔۔ سب کے جدا جدا مذاق
جس پہ کہ مر مٹا کوئی ۔۔۔ اب اُس اداکو بھول جا
عذرِ خطا، خطا سہی ۔۔۔ سُن نہ خطا، خطا معاف
عینِ خطا ہے گر کہوں ۔۔۔ عفو خطا کو بھول جا
زلزلۂ زمینِ ناز ۔۔۔ ممتحنِ نیاز ہے
دل کو بنا لے مستقل ۔۔۔ لغزشِ پاکو بھول جا
جس پہ مرض کا تھا گماں ۔۔۔ اصلِ شفا تو ہے وہی
لذتِ درد کو نہ بھول ۔۔۔ فکرِ دوا کو بھول جا
چشمِ طریق وا تو کر ۔۔۔ خود یہ پکار اُٹھے گا دل
قبلہ ترا کدھر نہیں ۔۔۔ قبلہ نما کو بھول جا
دیکھ بہک نہ آرزو ۔۔۔ دھیان تو کر کہاں ہے تو
تخلیۂ نیاز ہے
ناز و ادا کو بھول جا

(۲)

وہ سرِ بام کب نہیں آتا
جب میں ہوتا ہوں جب نہیں آتا

بہرِ تسکین وہ کب نہیں آتا
اعتبار آہ اب نہیں آتا

چپ ہے شکووں کی ایک بند کتاب
اُس سے کہنے کا ڈھب نہیں آتا

اُن کے آگے بھی دل کو چین نہیں
بے ادب کو ادب نہیں آتا

زخم سے کم نہیں ہے اُس کی ہنسی
جس کو رونا بھی اب نہیں آتا

منہ کو آجاتا ہے جگر غم سے
اور گلہ تا بہ لب نہیں آتا

زہر نعمت، نہ موت لائقِ شوق
کیا کریں چین جب نہیں آتا

بھولی باتوں پہ تیری دل کو یقین
پہلے آتا تھا اب نہیں آتا

دکھ وہ دیتا ہے اس پہ ہے یہ حال
لینے جاتا ہوں جب نہیں آتا

آرزو بے اثر محبت چھوڑ
کیوں کرے کام جب نہیں آتا

(۳)

کیوں کسی رہرو سے پوچھوں اپنی منزل کا پتا
موجِ دریا خود لگا لیتی ہے ساحل کا پتا

ہے نشانِ لیلیٰ مقصود محمل کا پتا
دلربا ہاتھ آگیا پایا جہاں دل کا پتا

راہِ الفت میں سمجھ لو دل کو گونگا رہنما
ساتھ ہے اور دے نہیں سکتا ہے منزل کا پتا

کہتا ہے ناصح کہ واپس جاؤ اور میں سادہ لوح
پوچھتا ہوں خود اسی سے کوئے قاتل کا پتا

راہبر رہزن نہ بن جائے کہیں اس سوچ میں
چپ کھڑا ہوں بھول کر رستے میں منزل کا پتا

آئی آوازِ پرِ تیر اور نکلی دل سے اُف
پھر نہ قاتل کا نشاں پایا نہ بسمل کا پتا

بانکی چتوں والے محشر میں ہزاروں ہوں تو ہوں
مل ہی جائے گا کسی صورت سے قاتل کا پتا

اُس جگہ بسمل نے دم توڑا جہاں کی خاک تھی
یوں لگاتے ہیں لگانے والے منزل کا پتا

پوچھنے والے نے یہ پوچھا کہ کیوں بیدل ہو کیوں
اور مجھ کو مل گیا کھوئے ہوئے دل کا پتا

موجیں ٹکرائی ہوئی دشمن بھی نکلیں دوست بھی
پیچھے کشتی کو ڈھکیلا دے کے ساحل کا پتا

رہ گیا ہے ٹوٹ کر زخمِ جگر میں تیرِ ناز
اب لگا لینا نہیں دشوار قاتل کا پتا

سوختہ پروانے، کشتہ شمع، فرشِ داغ دار
دے رہے ہیں رات کی گرمیِ محفل کا پتا

میں وفا کیش آرزو اور وہ وفا نا آشنا
پڑ گیا مشکل میں، پا کر اپنی مشکل کا پتا

(۴)

نگہِ کرم کا خواہاں، جو میں دلفگار ہوتا
کوئی اور تیر چلتا، کہ جگر کے پار ہوتا

ترا وعدہ سچ نہ ہوتا، مگر اعتبار ہوتا
کہ نشاطِ دل کا سامان غمِ انتظار ہوتا

مرے ساتھ دوستی کی، مرے سوزِ بے اثر نے
اگر آنچ اُن پہ آتی، تمھیں بے قرار ہوتا

ہیں چپ آسرا لگائے، اور انھیں یہی بہانہ
کہ یہ منھ سے کچھ تو کہتا، جو امیدوار ہوتا

ہوئی غم کی آگ پانی کہ جو آنکھ تر ہے ورنہ
جسے دیکھتے ہو قطرہ یہی اک شرار ہوتا

نہ زمیں کی طرح پڑتا ترے دل پہ اک نشاں بھی
مرا ایڑیاں رگڑنا کہ یہیں مزار ہوتا

مے غم میں لطف کیا ہے یہ مگر عجب مزا ہے
کوئی تلخ گھونٹ اترنا نہیں ناگوار ہوتا

ترے نازِ جاں ستاں سے یہ لگاؤ تھا اسی کو
کہ جدھر یہ تیر چلتا مرے دل کے پار ہوتا

یہی حد نہ تھی وفا کی کہ قضا پہ ختم کر دی
ابھی اور کیا نہ کرتے، اگر اختیار ہوتا

وہ کہیں کہ آرزو کو مری غفلتوں نے مارا
ابھی ہم یہ بات کہتے تو نہ اعتبار ہوتا

(۵)

نغمہ زن صوتِ نفس سے زندگی کا ساز تھا
نالۂ آخر شکستِ تار کی آواز تھا

بے کہے ہونے لگا ظاہر جو دل کا راز تھا
خود سکوتِ بے محل فریادِ بے آواز تھا

وحشت انگیزی میں یک رنگی گریباں گیر تھی
جتنے دیوانے تھے سب کا ایک ہی انداز تھا

مبتلا دہشت میں دل تھا تابع دل تھا خیال
آنے والی شامِ غم کا صبح سے آغاز تھا

پوچھتا تھا مجھ سے میرے دل کی بے تابی کا راز
ہائے اُس کی سادہ لوحی جو سراپا ناز تھا

تیرے دیوانے کی ہر بات اک معمّہ ہی رہی
اتنی رسوائی پہ بھی رازِ نہاں پھر راز تھا

دیکھ کر داغِ جنوں کو روتے روتے ہنس پڑا
رنگِ گل پر تھی ندامت بوئے گل پر ناز تھا

اس تراہے پر بھٹک جاتے تصور کے قدم
بند تھے آنکھوں کے دروازے درِ دل باز تھا

آپ اپنے جذب سے ہے آئنہ دارِ خرام
میرا دامانِ نگہ جو تیرا پا انداز تھا

عشق میں سو بار نالہ آکے لب تک رک گیا
بات اکیلے کی نہیں تھی دو دلوں کا راز تھا

سونے والے خاک کے کس کے جگائے جاگتے
صور کا غوغا کوئی بدلی ہوئی آواز تھا

آرزو برپا رہے ہنگامۂ ناز و نیاز
اپنی ساری زندگانی کا بس اتنا راز تھا

(٦)

خودی کے پھیر سے نکلا کہ گم تھا — وہ اک عالم نظر آیا کہ گم تھا
تصور چاہتا تھا خلوتِ تام — اُسے بند آنکھ سے دیکھا کہ گم تھا
نثار اس اپنی شوریدہ سری کے — ملا آخر وہ دروازا کہ گم تھا
شہیدِ ظلم کے پیکر سے پایا — ستم کا تیرے آئینا کہ گم تھا
ہوا جب آرزو یکطرفہ پیماں
خدا جانے میں تھا اس جا کہ گم تھا

(۷)

وہ کہتے ہیں میں تیرے گھر میہمان تھا
یہ سچ ہے تو اے بیخودی میں کہان تھا
دنوں کی دورنگی ہے کچھ اور ورنہ
جو آزارِ دل ہے یہ آرامِ جاں تھا
وہ دل ہی میں تھا جس کو ہم ڈھونڈتے تھے
یہ سب سچ ہے ہمدم مگر دل کہاں تھا

جہانِ آرزو ہر طرح سُکھ تھا وہ بھی
یہی تھی زمیں اور یہی آسماں تھا

(۸)

جب دوئی یک رنگ تھی اور ایک خلوت خانہ تھا
شمع پروانے میں گم تھی شمع میں پروانہ تھا
دور تھے ہوش و حواس اپنے سے بھی بیگانہ تھا
اُن کو بزمِ ناز تھی اور مجھ کو خلوت خانہ تھا
کھینچ لایا تھا یہ کس عالم سے کس عالم میں ہوش
اپنا حال اپنے لئے جیسے کوئی افسانہ تھا
بن گیا دم بھر میں شعلہ ہو گیا حاصل سکون
مضطرب پروانہ تھوڑی دیر کو پروانہ تھا
حالتِ زارِ جنوں سے ہوش کو کیا واسطہ
آپ میں آیا ہوا دل آپ سے بیگانہ تھا
اضطرابِ روح سے ٹوٹا عناصر کا طلسم
قید آخر تا بہ کے دیوانہ پھر دیوانہ تھا
اُف یہ طوفان خیزیاں اے بادۂ سرجوشِ عشق
غرق کر دینے کو اِک دریا تھا جو پیمانہ تھا

چھوٹے چھوٹے دو ورق جل جل کے دفتر بن گئے
درسِ حسرت دے رہا تھا جو پرِ پروانہ تھا

جان کر وارفتہ اُن کے چھٹنے کی دیر تھی
پھر تو دل اِک ہوش میں آیا ہوا دیوانہ تھا

جرمِ اُلفت بخشوا کر سر اُٹھایا پاؤں سے
یہ نیازِ عشق بھی اِک نازِ معشوقانہ تھا

ضو فشاں ہونے لگا جب دل میں حسنِ خود نما
پھر تو کعبہ آرزو کعبہ نہ تھا بُت خانہ تھا

(۹)

لائق گرفت کے ترا ظلمِ نہاں نہ تھا
دل کھا رہا تھا چوٹ پہ چوٹ اور نشاں نہ تھا

اپنا حجاب ہونگا میں خود یہ گماں نہ تھا
اُس جا کہ پردہ آنکھ کا بھی درمیاں نہ تھا

دل مقتلِ وفا ہے سلامت تمھارے ظلم
کل تک یہاں زمین تو تھی آسماں نہ تھا

نیرنگیاں چمن کی طلسمِ فریب ہیں
اُس جا بھٹک رہا ہوں جہاں آشیاں نہ تھا

باتیں وہی، اثر وہ نہیں اسکو کیا کرے
پیغامبر لئے ہوئے میری زباں نہ تھا

جوشِ وفا درست ہے دعوائے خوں غلط
جنبش رگوں میں آپ تھی خنجر رواں نہ تھا

عہدِ ازل میں اصل حقیقت جو پوچھیے
سب آپ ہی کا قول تھا میرا بیاں نہ تھا

پابندیوں نے کھول دیں آنکھیں تو سمجھے ہم
آکر قفس میں بس گئے تھے آشیاں نہ تھا

خود حسن کی کشش کا ہے اک نام عشق بھی
پرتو نہ تھا تو آئینے کا بھی نشاں نہ تھا

باتوں میں جب ہو ربط کہ قابو میں دل بھی ہو
اک نوحہ خوانِ درد تھا میں قصہ خواں نہ تھا

جو درد مٹتے مٹتے مجھی کو مٹا گیا
کیا اُس کا پوچھنا کہ کہاں تھا کہاں نہ تھا

اب تک وہ چارہ سازیِ چشمِ کرم ہے یاد
پھاہا وہاں لگاتی تھی چرکا جہاں نہ تھا

بیٹھے بٹھائے مفت کی تہمت ہے آرزو
میرا سکوتِ حسرتِ دل کا بیاں نہ تھا

(۱۰)

دل بھر آیا جو عدو کا بھی سہارا ٹوٹا
آنکھ سے اشک گرا چرخ سے تارا ٹوٹا

ہم کو اتنا بھی رہائی کی خوشی میں نہیں ہوش
ٹوٹی زنجیر کہ خود پاؤں ہمارا ٹوٹا

کام جب ختم ہو بیکار رہے پھر آلۂ کار
کٹتے ہی عمرِ رواں سانس کا آرا ٹوٹا

منحصر ڈوبنا کشتی کی تباہی پہ نہیں
پاؤں ساحل پہ دھرا تھا کہ کگارا ٹوٹا

آرزو اشک رکے ڈوب پسینے کے چلے
اُٹھا طوفان، جو بہتا ہوا دھارا ٹوٹا

(۱۱)

بنا لیا اُس نے اپنا قیدی، لگا کے عہدِ وفا کا پھندا
رسن ہے ہاتھوں میں بے بسی کی، گلے میں صبر و رضا کا پھندا

وفا کی مجبوریاں قیامت، حیا کی پابندیاں اک آفت
جدھر بھی جاتے ہیں جانے والے، لگا ہوا ہے قضا کا پھندا

پھنسے ہوئے ہیں غم و محن میں، لڑیں ہزاروں ہیں اک رسن میں
نہ قید رہتی کسی طرح کی، جو کاٹ سکتے حیا کا پھندا

علاج سے خوف کر رہا ہوں، مزاج سے اپنے ڈر رہا ہوں
کہ بیٹھے بیٹھوں تو ہو کے اچھو، گلا نہ کس دے دوا کا پھندا

وہ ہچکیوں پہ یہاں تھلا رہا ہے، لُبھا چکا اب ستا رہا ہے
لبوں پہ دم کھینچ کھینچ کے آ رہا ہے، سرک رہا ہے وفا کا پھندا

میں آرزو زورِ چرخ ڈھا دوں۔ زمیں کے ساتوں طبق ہلا دوں
مگر جہاں شل ہیں دونوں بازو، وہ ہے فریبِ وفا کا پھندا

(۱۲)

رشک کے مقتل میں ہو ہر آن ساماں دوسرا
چاہیے ہے ناز کا خنجر بھی ہاں ہاں دوسرا

بڑھ کے جامِ زہر سے قاتل ہے چشمِ التفات
دوست جب تم ہو تو کیوں ہو دشمنِ جاں دوسرا

زور کرلے طوقِ آہن پر جو ہو کچھ حوصلہ
اب کہاں سے اے جنوں لاؤں گریباں دوسرا

پہلے بالائے زمیں تھے آ بسے اب زیرِ خاک
طول نے میعاد کے بدلا ہے زنداں دوسرا

آرزو ہمت تو ہو لٹنے میں بھی کب ہے زیاں
غیب کے پردے سے ہو جاتا ہے ساماں دوسرا

(۱۴)

ہوں گے حسیں ہزاروں لیکن کہاں تم ایسا
ایذا رساں بھی ہوکر آرامِ جاں تم ایسا

جوہر وفا کے پاکر جوہر کیا ہے دل کو
ہم تو یہی کہیں گے ہو قدرداں تم ایسا

خوں گشتہ میرے دل کا مقتل ہے وہ بھیانک
ہتھیار ڈر کے رکھ دے قاتل جہاں تم ایسا

دے آسماں جو چکر بسنے نہ دے زمیں بھی
بن جائے کیوں کر آخر سارا جہاں تم ایسا

کیا بے اثر کیا ہے یہ کہہ کے رازِ دل کو
ہاں آرزو نہیں ہے جادو بیاں تم ایسا

(۱۴)

اسے کیا جانے وہ ہے میرا اندازِ سخن جیسا
وہی نکلیں گے معنی ہوگا جس کو حسنِ ظن جیسا
اُڑھادی وادیٔ غربت میں چادر گرد نے آکر
ملا آخر وہی لکھوا کے لائے تھے کفن جیسا
وہی چیتون ہے اب بھی کاٹ کر راتیں پہاڑ ایسی
کوئی کیوں اتنا بے ہمت بنے تھا کوہ کن جیسا
چراغِ ہوش افسردہ تھا شمعِ بزم کے آگے
میں اب ویسا نہیں ہوں تھا میانِ انجمن جیسا
بہارِ تازہ آجاتی ہے جب انگور پھٹتا ہے
نہ ہوگا ایسا غنچہ دل میں ہے زخمِ کہن جیسا
لہو رونے سے آنکھیں سُرخ چہرہ ارغوانی ہے
بہار آئے گی ویسی ہی لگائیں گے چمن جیسا
تکلف سے غرض ہی آرزو کیا خاکساروں کو
پہن لو شکر کر کے مل رہا ہے پیرہن جیسا

کہتا ہے ہنس کے گل مری(۱۵) شمعِ مزار کا
یوں ہو خزاں کہ رنگ نہ اُکھڑے بہار کا
گرنا زمیں پہ بوند اور اُٹھنا غبار کا
دیوانے جاگے آ گیا موسم بہار کا
بجھنے کو ہے چراغ شبِ انتظار کا
چہرہ اُترتا جاتا ہے امیدوار کا
ہوتے ہیں تیری جنبشِ لب پر چمن نثار
غنچے میں جوش بند ہے پوری بہار کا
آخر کچھ امتحانِ تحمل کی حد بھی ہے
پتھر نہ جانو دل ہے یہ امیدوار کا
اس منفت کے کرم سے تو رکھئے مجھے معاف
میں کیا کروں وہ دل جو نہیں اختیار کا
وہ اُن کا اِک مٹاتے ہوئے کو پکارنا
وہ کانپ کر زمین سے اُٹھنا غبار کا
بدلی کی چھاوں سی اِدھر آئی اُدھر گئی
جھپکی پلک کہ ختم تھا موسم بہار کا

چھوڑو فریب وعدہ دوا زہر بن چکی
روگ اور بڑھ رہا ہے دلِ بیقرار کا

مجھ کو اسی زمیں پہ مٹایا ہے چرخ نے
جا ہو جہاں نشان سمجھ لو مزار کا

راہِ ہوس میں دوڑ نہ اتنا کہ پھولے سانس
اس پھونک سے بجھے گا چراغ اعتبار کا

بن کر عذابِ جاں جو رہا بھی تو کیا رہا
دل خود گنوا دیا کہ نہ تھا اختیار کا

ہنگامِ صبح بجھ گئی یہ کہتے کہتے شمع
ہم بھی چلے جو وقت گیا انتظار کا

اب ٹھوکریں ہی ٹھوکریں ہیں مثلِ برگِ خشک
چل آرزو کہ ختم ہے موسم بہار کا

(۱۶)

قسم تو کھائی مگر اجتناب ہو نہ سکا
گناہ گار ہوا کامیاب ہو نہ سکا

جہانِ شوق کا اللہ رے اختلافِ مذاق
قبولِ عام کوئی انتخاب ہو نہ سکا

جمالِ ہوش ربا خود ہے پردہ دار اپنا
نقاب اُٹھا کے بھی وہ بے نقاب ہو نہ سکا

لبِ خموش سے ٹکرائی بھی فغاں تو فضول
سوال ہی پلٹ آیا جواب ہو نہ سکا

جو کوئی حد ہو معیّن تو شوق شوق نہیں
وہ کامیاب ہے جو کامیاب ہو نہ سکا

غریب کا بھی خدا ہے فدائے خوئے کرم
عتاب آ تو گیا تھا عتاب ہو نہ سکا

دلِ گداختہ بے کیف ہے تو پانی ہے
پگھل گیا مرا شیشہ شراب ہو نہ سکا

سوا تھا دستِ طلب سے لپک میں شعلۂ حسن
ہزار بچ کے چلے اجتناب ہو نہ سکا

بری سرشت نہ بدلی جگہ بدلنے سے
چمن میں آ کے بھی کانٹا گلاب ہو نہ سکا

جبیں سے فردِ گنہ پر ٹپک پڑا جو عرق
مغالطے ہوئے اتنے حساب ہو نہ سکا

چلا نہ جذبِ محبت سے زورِ ناز و غرور
جواب بن کے خود آئے جواب ہو نہ سکا
نگاہِ شوق نہ تھی روشناسِ جلوۂ ذات
میں در تک آ تو گیا باریاب ہو نہ سکا
سکوت آرزو اُن کا ہے حرفِ بے آواز
مرے سوال کا یعنی جواب ہو نہ سکا

(۱۷)

مبارک شان سے چھٹنا اسیرِ درد و حرماں کا
اکھڑنا سانس کا ہے ٹوٹنا زنجیرِ زنداں کا
قرار اب لے گی مشتِ خاک اپنی بعد بربادی
کہ اِس پیکر میں ہے ایک ایک ذرہ ہر بیاباں کا
اگر یہ بات سچ ہے جان صدقہ آبرو کا ہے
تو پھر تارِ گریباں سے ہے کم رتبہ رگِ جاں کا
یہی ہے زیست کی لذت میں اپنے درد کے صدقے
یہ نادانوں نے کیوں جھگڑا لگا رکھا ہے درماں کا
بلائے جاں بنی بالیدگی بھی موسمِ گل میں
دکھے دیتا ہے پھانسی تنگ ہو جانا گریباں کا

بلا کا جذب دیوانے کے خوابِ شوق رکھتے ہیں
جھپکنا آنکھ اور زنداں میں کھنچ آنا بیاباں کا

وہ دینا اور تھی جیسے یہ عالم اور ہے گویا
جب آنا ہوش پھر جھپکے سے سی لینا گریباں کا

جو اور آ جائے پروانہ تو پھر یوں نہیں جلا ڈالے
فریب قاتلانہ ہے لرزنا شمعِ گریاں کا

ہوا کہرام برپا آرزو ہجرِ تن و جاں پر
جنازے کا نکلنا تھا نکلنا گھر سے مہماں کا

(۱۸)

سماں سحر کو کہاں رات کے فسانے کا
پلک جھپکتے ہی اُلٹا ورق زمانے کا

چمن وسیع ہے محدود قوتِ پرواز
ٹھکانا روز بدلتا ہوں آشیانے کا

تلاش جوہرِ مقصد میں گم ہوا تو ہوا
پتا لگا لیا دل نے چھپے خزانے کا

یہ دل سے خود خلشِ تیرِ ناز کہتی ہے
کماں کا زور بنا جذب اس نشانے کا

بڑے مزے کے تھے الزام اگرچہ چھوٹے تھے
پھر آج ہاں کوئی ٹکڑا راہی فسانے کا

اس آرزو میں کہ چھلکا دے کوئی جوڑ کے پھر
شکستہ جام لئے ہوں شراب خانے کا

لگاؤ تیر کہ آئین کار پورا ہو
فرشتہ موت کا ہے منتظر بہانے کا

طلب سے اُس کی ہے کم دو جہاں کا سرمایہ
فقیر جائے کہاں تیرے آستانے کا

زبان و دل میں ہمارے نہ فرق ڈال سکا
منافقانہ عمل آرزوؔ زمانے کا

(۱۹)

دیا وہ درد کہ جس میں سرورِ جاں دیکھا
تری نظر ہی کو دل کا مزاج داں دیکھا

ہر ایک جا تجھے دیکھا مگر کہاں دیکھا
جدھر نگاہ مڑی پردہ درمیاں دیکھا

عدو نہ تھی مگر اندھی ضرور تھی بجلی
کہ دیکھے پھول نہ پتے نہ آشیاں دیکھا

ہوا سمیٹے رہی مشتِ خاک وحشی کی
ہمیشہ ایک بگولا رواں دواں دیکھا

نگار خانۂ ہستی ہے سیلِ گاہِ فنا
نشاں مٹاتا ہوا اس کا ہر نشاں دیکھا

وہ تلخ زہر تھے جو نعمتوں کے بھیس میں تھے
نشاط حرص کو خود کر کے رائگاں دیکھا

ہزار اُلٹے حجاباتِ حسن کے دفتر
پھر اک نہ اک ورقِ سادہ درمیاں دیکھا

سکونِ دل ابھی تصدیقِ اضطراب میں ہے
نہ آنکھ کھول مگر کہہ تو دے کہ ہاں دیکھا

عجب طلسم ہیں یہ کروٹیں زمانے کی
نئی زمین نیا روز آسماں دیکھا

غضب تھا خاتمۂ سوزِ عشق کا منظر
بھڑکتے شعلے کو بنتے ہوے دھواں دیکھا

تھے اختیار بھی دیکر وہ جبر پر مجبور
اسیر کر لیا جس کو رواں دواں دیکھا

زمین خون کی ہے آسمان خنجر کا
نگاہِ ناز ترا دارِ امتحان دیکھا

جتا نہ مفت کا احسان دیکھ برقِ جمال
جھپکتے آنکھ تو دیکھی تجھے کہاں دیکھا

عدوئے واسطہ ہے جذبِ عشق کی تکمیل
وہ پہلے کشتہ ہوا جس کو درمیاں دیکھا

سزا بنی ہوسِ ناروا کی دیدِ جمال
نظر نے اپنے ہی جلنے کا کچھ دھواں دیکھا

فقط تھی عجزِ طلب حسنِ بے نقاب کی آن
جہاں نگاہ نہ پہنچی اُسے وہاں دیکھا

سرِ نیاز بھی اب آرزو ہے قابلِ ناز
کہ جس جگہ یہ جھکا اُس کا آستاں دیکھا

(۲۰)

نہ کر تلاش اثر تیر ہے لگا نہ لگا
جو اپنے بس کا نہیں اُس کا آسرا نہ لگا

حیاتِ لذتِ آزار کا ہے دوسرا نام
نمک چھڑک تو چھڑک زخم پہ دوا نہ لگا

مرے خیال کی دنیا ہے اس جہاں سے دور
یہ بیٹھے بیٹھے ہوا گم کہ پھر پتا نہ لگا

خوشی یہ دل کی ہے اس میں نہیں ہے عقل کو دخل
برا وہ کہتے رہے اور کچھ برا نہ لگا

جو کچھ ملا ہے وہ سب سربسر ہے یعنے
کہ دست بردِ سپہر ہاتھ بے رضا نہ لگا

چمک سے برق کی کمتر ہے وقفۂ دیدار
نظر ہٹی کہ اُسے ہاتھ اک بہانہ لگا

مری تلاش تھی تشویش دیدۂ بے نور
وہ ملتے کیا مجھے اپنا ہی جب پتا نہ لگا

ملی نظر سے نظر آرزو کہ ہوش نہ تھے
جھکائے آنکھوں کو قدموں سے اُٹھ کے جانہ لگا

(۲۱)

زباں پر غمِ دل جو لانا پڑے گا
شکایت کا پہلو بچانا پڑے گا

دیا رنج خود بھی اٹھانا پڑے گا
کہ ملنے کا بھی جب بتانا پڑے گا

لرزتا ہے دل قبر کی تیرگی سے
اور اک روز مجبور جانا پڑے گا

غمِ عشق کی موت میں زندگی ہے
جو یہ زہر بھی ہے تو کھانا پڑے گا

جو سینے میں دل ہے تو بارِ محبت
اُٹھے یا نہ اُٹھے اُٹھانا پڑے گا

یہی ہے اگر حُسن کی بے نیازی
تو اپنے کو خود ہی مٹانا پڑے گا

محبت نہیں آگ سے کھیلنا ہے
لگانا پڑے گا۔ بجھانا پڑے گا

زمانے سے ناز اپنے اُٹھوانے والے
محبت کا بوجھ آپ اُٹھانا پڑے گا

حیا مانعِ نالہ۔ ضبط آفتِ جاں
کلیجے میں نشتر چھپانا پڑے گا

سزا تو بجا ہے' یہ اندھیر کیسا؟
خطا کو بھی خود ہی بتانا پڑے گا

وہ ہنس کر اگر حال دل پوچھ بیٹھے
جو کچھ یاد ہے بھول جانا پڑے گا
لب زخم دل تیرا قاتل تبسم
دکھانے کا ہے اور چھپانا پڑے گا
نہ پوچھ آرزو جزر و مد عاشقی کے
اُبھرتے ہی پھر ڈوب جانا پڑے گا

(۲۲)

جس کی جیسی طینت ہوگی ، ویسا ہی سب کو بتائے گا
داغی آئینہ جب دیکھوگے ، دھبا منھ پر آئے گا
دل کہ ہے شیشے سے نازک تر ، شوق کی ضد میں پتھر ہے
اتنی ہی ہمت بڑھ جائیگی ، جتنی چوٹیں کھائے گا
ضبط سے لینگے کام وہیں تک ، جتنی ہم کو ضرورت ہے
آہ زباں پر آجائے گی ، نام نہ لب تک آئے گا
کل نہ سہی دیدار کا وعدہ ، حشر کے بھی کچھ بعد سہی
جا ہی رہا ہے جاتا زمانہ ، وہ دن بھی آجائے گا
عشق کی بے تابی ہے نتیجہ ، حسن کی بڑھتی شوخی کا
مفت کی بدنامی ہم کیوں لیں ، خود پردہ اُٹھ جائے گا

خوف میں رسوائی کے جس کو ، در سے اُٹھائے دیتے ہو
جب وہ پھرے گا مارا مارا ، پھر کس کا کہلائے گا
یا تو لگاوٹ کر کے نہ چھیڑو ، یا یہ بتا دو پہلے سے
جوشِ دل کا اُبلتا چشمہ ، کس دُنیا میں سمائے گا
وقتِ اجل دریافت کریں وہ ، پوچھنے جو یہ آئے ہیں
راتوں کی نیند اُڑانے والے ، چین تجھے کب آئے گا
وصل کا خواہشمند بنے کیوں ، حُسن کا سچّا پروانہ
دل سے لگی ہے لاگ تو اک دن ، خود شعلہ بن جائے گا
پردے نے بے تاب کیا تھا ، جلوے نے بے ہوش کیا
آرزوِ وارفتہ طبیعت ، آپ میں اب کیا آئے گا

(۲۴)

جہاں تک من و تو کا جھگڑا رہے گا ، کوئی شے ایں ہم بھی یہ دھوکا رہے گا
ادا نا شناسوں کو دھوکا رہے گا ، نگاہوں میں جلوہ بھی پردا رہے گا
رہی خاک پروانہ اپنی ہوا میں ، تو شعلہ بھی دامن جھٹکتا رہے گا
زباں کھو چکی تاب دے جام ساقی ، جو کھل بھی پڑوں گا تو پردا رہے گا
سمجھتا ہے اُس جنبشِ لب کا منشا ، ابھی دوڑتا خون ٹھہرا رہے گا
دو روزہ جوانی کے زور اللہ اللہ ، کہ جیسے اِسی کا زمانا رہے گا

ہے فرق اہل و نا اہل کے امتحاں میں — نظر رکھنے والوں سے پردا رہے گا
سمجھ رکھ یہ اے خنجرِ ناز قاتل — کہ جائے گا سر بھی تو سودا رہے گا
گزشتہ کرم کے ہوئے غضب ہیں — وہ اب اور بھی یاد آتا رہے گا
تجھے اِس ہوا میں چراغِ تمنا — کہ آنکھیں ہیں گی تو پردا رہے گا
ہزاروں ہی ساماں فریبِ نظر کے — سلامت ہیں آنکھیں تو اندھا رہے گا
بڑی دشمنی کر گئے دوست بن کر — اب اُن سے سوا دل ستاتا رہے گا
جسے جان ہی بڑھ کے ہے آن پیاری — جو ڈوبے گا بھی وہ تو پیاسا رہے گا

مٹا دے گا خود آرزو وہم ہستی
جو یوں ہی ہجومِ تمنا رہے گا

(۲۴)

فرقت کی تسلی کا بھی کوئی ، دستور بنائے رکھئے گا
حسرت ہی کو دل ہی نکلنے تک ، اک جور بنائے رکھئے گا
سب آپ کے ناز سر آنکھوں پہ ، دل آخر ہم بھی رکھتے ہیں
کب تک ایسے ناچاروں کو ، مجبور بنائے رکھئے گا
کہنے کو تو سب کچھ دیکھ لیا ، اور پوچھئے سچ تو کیا دیکھا
کیا وہم کی ماری آنکھوں کو ، بے نور بنائے رکھئے گا
گو ننگا ہو کہ الکن دونوں کو ، اُمید کلیم بناتی ہے

اب ذرہ ذرہ عالم کا ، اک طور بنائے رکھیئے گا
بچ لیتا ہے نام کا جب ڈنکا ، پھر گڑتا ہے سولی کا جھنڈا
پہلے ہی سے نصرت خواہوں کو ، منصور بنائے رکھئے گا
اس بار امانت سے آخر ، ہوتا ہے کبھی چھٹکارا بھی
یا منفت کے اِن حمالوں کو ، مزدور بنائے رکھئے گا
دُھوکے میں نہ سر جھکوا دے کہیں آیا ، یہ حُسن بڑا ہی کافر ہے
اِس جھوٹی دنیا میں مجھ کو ، مغرور بنائے رکھئے گا
انکار جفا ہے خو جن کی ، داد آرزو اُن سے لینا ہے
اِن رِستے بہتے زخموں کو ، ناسور بنائے رکھئے گا

(۲۵)

گئے دل کے لئے نہ روئیے گا ، آرزو کیا کچھ اور کھوئیے گا
آنکھ لگنے کے وقت تھی نہ خبر ، ہم تو جاگیں گے آپ سوئیے گا
شادی و غم جہاں میں توام ہیں ، جتنا ہنسئے گا اتنا روئیے گا
پھر وہی نوک جھونک پھر وہی چھیڑ ، دل میں نشتر کوئی چبھوئیے گا
جوشِ غم اور یہ ضبط کی تاکید ، ناؤ خشکی میں کیا ڈبوئیے گا
رِستے ناسور دل کے کہتے ہیں ، آنکھیں جب تک رہیں گی روئیے گا
آرزو غفلتِ شباب ہے قہر ، صبح ہوجائے گی جو سوئیے گا

(۲۶)

ملک اُس سے سیکھیں کہا مان جانا
جسے آدمیت نے انسان جانا

سراب تماشا تھے وہ سب سہارے
جنہیں کامیابی کا سامان جانا

جنوں میرا پختہ ہے اور جوش اندھا
جہاں ہاتھ الجھا گریبان جانا

مٹاتا ہے کون آپ اپنی امیدیں
اسے بھی محبت کا فرمان جانا

مرے شوق نے غیریت دور کر کے
ترا دامن اپنا گریبان جانا

حذر اس رعونت کی لعنت سے جس نے
مقرب فرشتے کو شیطان جانا

سرِ شوق ٹکرا گیا بند در سے
اب آساں ہے منزل کو پہچان جانا

بلا شرط منظور عہدِ محبت!
کہ ہم کو بھی آتا ہے قربان جانا

پسِ عفو تقصیر یہ بھی بتا دو
بناتے ہو ناداں کہ نادان جانا

وہ پیمانِ الفت ارے توبہ توبہ
جہاں شرط پہلی ہے ایمان جانا

خطا تھی تو کب قابلِ درگزر تھی
یہ انسانیت کی کہ انسان جانا

کوئی نقشِ امید جمنے نہ دے گا
مرا کچھ بھی کہنا ترا مان جانا

مرے غم سے دنیا کو تھا واسطہ کیا
پریشاں نظر نے پریشان جانا

بتا ساکنِ گور ہوتا ہے کیسا
اکیلے نئے گھر میں مہمان جانا

درِ دیر اور آرزو توبہ توبہ
خطا کی جو سیدھا مسلمان جانا

(۲۷)

دیا جب محبت نے الفت کا مینا
ہوا آرزو دوسرا نام اپنا

نیا جس میں اب ہے نیا نام اپنا
چلا ہوں میں خود دے کے پیغام اپنا

ترے ناز بردار سا کون ہوگا
جو خود اور کو دے دے آرام اپنا

خدارا نہ دو بدگمانی کا موقع
کہلوا کے اوروں سے پیغام اپنا

حرم میں بھی نکلی بتوں کی خدائی
کہاں جا کے ٹوٹا ہے احرام اپنا

ہوس کار عاشق بھی ایسا ہے جیسے
وہ بندہ کہ رکھ لے خدا نام اپنا

ملامت ہے بیچارگی خودکشی پر
نہیں چاہتا کون آرام اپنا

بدلتی ہے ہر ہر نفس دل کی حالت
نئی ایک منزل ہے ہر گام اپنا

وہی کامیابِ وفا ہے جو خود گم
پکارے انہیں بھول کر نام اپنا

اس اندازِ مستی پہ ساقی پشیماں تو ہے
پشیمان ہوں توڑ کر جام اپنا

[illegible]
کہ ہر لفظ ہے اب تو اک نام اپنا

جو دل ٹوٹنے پر بھی امید ٹوٹے
بدل ڈالیں ہم آرزو نام اپنا

(۲۸)

مثالِ شمع سکھا دے کہیں گرمِ فغاں ہونا
جلا اتنا کہ آخر آ گیا دل کو زباں ہونا

زباں جب بپ ہے کہ جو دل پہ گزرتی ہے وہ دل جانے
بیانِ حال کو کافی نہیں ہے راز داں ہونا

اُدھر بجلی نشیمن پر گری آنکھیں اِدھر جھپکیں
یہ دل کس کا کہ دیکھے اپنی محنت رائگاں ہونا

بگولا کیوں بنائے ہے نفس اِس جسمِ خاکی کو
نہیں منظور رسوائی کا اپنی خود نشاں ہونا

یہ غم کی آگ کیسی اندر اندر پھیلی جاتی ہے
لہو جلنا رگوں میں سانس سے پیدا دھواں ہونا

نگاہِ شوق میں یکساں ہے بسمل ہونے والوں کی
چھری کا سیف بننا تجھ سے کمسن کا جواں ہونا

موافق ہو ہوائے باغ تو دم بھر میں ممکن ہے
یہی پھیلے ہوئے تنکے سمٹ کر آشیاں ہونا

پلک جھپکی کہ منظر ختم تھا برقِ تجلّی کا
ذرا سی نعمتِ دیداُس کا بھی یوں رائگاں ہونا

سمجھ لے شمع سے اے ہم نشیں آدابِ غم خواری
زباں کٹوانے والے کا ہے منصب راز داں ہونا

نمازِ عشق پڑھ لو آرزو وقتِ فضیلت ہیں
فغاں بر لب ہے دل اور نام اپنی کا ہے اذاں ہونا

(۲۹)

کوئی بھی جز قیس لیلےٰ کا نہ دیوانہ ہوا
شوق نے پردے دئے جس کو وہ پروانہ ہوا

دوست چھوٹے دشمنِ جانی سے یارانہ ہوا
ہوش میں نے کیا سنبھالا اور دیوانہ ہوا

ٹھیکرا کل تک تھا، قابل ظرف کہنے کے نہ تھا
جذب پیدا کر لیا دل نے تو پیمانہ ہوا

دل کے ہر ذرّے میں اب ہے پرتو برقِ جمال
ایک شیشہ چور ہو کر آئینہ خانہ ہوا

ساقیا اس گردشِ چشمِ کرم کے میں نثار
عمر بھر پیتا رہا خالی نہ پیمانہ ہوا

اللہ اللہ حسن کی یہ پردہ داری دیکھئے
بھید جس نے کھولنا چاہا وہ دیوانہ ہوا

آرزو ٹوٹا نفس کا سلسلہ ہچکی کے ساتھ
آپ بھی سو جائیے بس ختم افسانہ ہوا

(۳۰)

آنسو تھمے تو کیا غم پنہاں نہیں رہا
اب داغِ درد ہے کہ نمایاں نہیں رہا
رسوائی مزید کا امکاں نہیں رہا
اِن دھجیوں کا نام گریباں نہیں رہا
خود ہے یہ رنگ اُڑا ہوا چہرہ زبانِ حال
پردہ ہٹا تو درد بھی پنہاں نہیں رہا
بے چین ہے بہت قفسِ عنصری میں روح
اب یہ اسیر لائقِ زنداں نہیں رہا
مہماں نواز وادیِ غربت کی خاک تھی
لاشہ کسی غریب کا عریاں نہیں رہا
جوشِ گلو خلاصیِ وحشت کو کیا کہوں
کچھ امتیازِ طوق و گریباں نہیں رہا
دشواریاں ہیں عشق میں لذت فزائے شوق
آساں اسی لئے ہے کہ آساں نہیں رہا
ہونے پہ شوقِ دل کے ابھی تو ہے اعتراض
بگڑیں گے اس پہ بھی جو کہوں ہاں نہیں رہا

وعدے پر اعتبار مقدر سے نا امید
دل قابلِ تسلیِ جاناں نہیں رہا
آنسو بنا جبیں کا عرق ضبطِ اشک سے
بدلا بھی غم نے بھیس تو پنہاں نہیں رہا
ہیں آرزو وہی دل مرحوم بھی وہی
ملنے کی چاہ بڑھ گئی امکاں نہیں رہا

(۲۱)

زبانِ حق نے اُسے رمز آشنا نہ کہا
کہ جس نے درد کہا عشق کو دوا نہ کہا
کہا کسی نے محبت کا راز یا نہ کہا
چپ اُن کی ایک کئے دیتی ہے کہا نہ کہا
اگر کہا اُسے دلبر تو مطلب دل بھی
کہا ضرور یہ کہئے کھُلا کھُلا نہ کہا
جو فرشِ راہ رہا اُس نے اپنی ہستی کو
ادب سے خاک کہا پھر بھی خاکِ پا نہ کہا
یہ ایک حسنِ بیاں ہے مبالغہ تو نہیں
ادا کو تیرِ ستم کہہ دیا، ادا نہ کہا

میں عرضِ حال میں جبتک زبان کو روکوں
تری بدلتی ہوئی چتونوں نے کیا نہ کہا

کلیمِ شوق کی لکنت پہ سرزنش کیوں ہے؟
جو کہہ سکا وہ کہا جو نہ کہہ سکا نہ کہا

زبان کا فرق حقیقت بدل نہیں سکتا
یہ کوئی بات نہیں بت کہا خدا نہ کہا

اسی نہ کہنے میں کہہ گزرا آرزو سب کچھ
کہ میں نے تجھ سے کبھی کوئی مدعا نہ کہا

(۳۲)

وہ کیا لکھتا جسے انکار کرتے بھی حجاب آیا
جوابِ خط نہیں آیا تو یہ سمجھو جواب آیا

زمانے کو تری غفلت سے کیا بے چین خواب آیا
کہ ہر کروٹ پہ بدلا رنگِ عالم انقلاب آیا

قریبِ صبح یہ کہہ کر اجل نے آنکھ جھپکا دی
ارے او ہجر کے مارے تجھے ابتک نہ خواب آیا

دل اُس آواز کے صدقے یہ مشکل میں کہا کس نے
نہ گھبرانا نہ گھبرانا میں آیا اور شتاب آیا

کوئی قتال صورت دیکھ لی مرنے لگے اُس پر
یہ موت اک خوشنما پردے میں آئی یا شباب آیا

پُرانے عہد ٹوٹے ہو گئے پیماں نئے قائم
بنا دی اُس نے دُنیا دوسری جو انقلاب آیا

غلط فہمی سے غم کی جا خوشی ہے چارہ سازوں کو
مجھے تو موت آئی وہ سمجھتے ہیں کہ خواب آیا

گزرگاہِ محبت بن گئی اک مستقل بستی
لگا کر آگ آیا گھر کو جو خانہ خراب آیا

نہ ہٹتی تھی نظر در سے نہ رہی بند ہوتا تھا
کھلی آنکھوں پہ رکھا ہاتھ اجل نے جب تو خواب آیا

معمہ بن گیا رازِ محبت آرزو یوں ہی
وہ مجھ سے پوچھتے جھجکے مجھے کہتے حجاب آیا

(۳۳)

دل سے رہا تھا جو اُسے بے دل بنا دیا
آسان کام آپ نے مشکل بنا دیا

ہر سانس ایک شعلہ ہے ہر شعلہ ایک برق
کیا تو نے مجھ کو اے تپشِ دل بنا دیا

اِس حُسنِ ظن پہ ہم سفروں کے ہوں یا بہ گل
مجھ بے خبر کو رہبرِ منزل بنا دیا

اندھا ہے شوق پھر نظر امکاں پر ہو کیوں
کام اپنا دل نے آپ ہی مشکل بنا دیا

ساتھ آئیں تیری یاد کے اتنی مسرتیں
سُنسان دل کو غیرتِ محفل بنا دیا

دوڑا لہو رگوں میں بندھی زندگی کی آس
یہ بھی بُرا نہیں ہے جو بسمل بنا دیا

نازو غرورِ حُسن دکھانے کے شوق میں
اک مشتِ خاک اُٹھا لی اور اک دل بنا دیا

غرق و عبور دونوں کا حاصل ہے ختمِ کار
مجبوریوں نے موج کو ساحل بنا دیا

دل سے وفا شعار کو عادت بگاڑ کر
اتنے اُٹھائے ناز کہ قاتل بنا دیا

اِس شانِ عاجزی کے فدا جس نے آرزو
ہر ناز ہر غرور کے قابل بنا دیا

(۳۴)

مجھ کو دل قسمت نے اُس کو حُسنِ غارت گر دیا
چور کر دے کیوں نہ وہ شیشہ جسے پتھر دیا

اُس سے طالب ہوں دیت کا آپ سے مطلب نہیں
جس نے گردن ایک کو دی ایک کو خنجر دیا

تھا مکافاتِ عمل احباب کا حُسنِ عمل
یہ بھی ایسا قرض تھا جو اور سے لے کر دیا

اب نہ ہے فکرِ تقاضت اور نہ تعبیقِ رفعِ کار
دینے والے نے دیا اور میری خواہش بھر دیا

گریۂ بے اختیارِ غم بھی تھا فطری علاج
جس نے تھوڑے جوش کو ہر مرتبہ کم کر دیا

جس میں کینۂ غم نہیں باز آئے ایسے دل سے ہم
یہ بھی دینا ہے کوئی آئے تو نہ دی ساغر دیا

آرزو اک روز ڈھا دیتا مجھے میرا ہی زور
یہ بھی اُس کی کارسازی دل میں جس نے ڈر دیا

(۳۵)

ایک دل میں غم زمانے بھر کا کیوں کر بھر دیا
خوئے ہمدردی نے کوزے میں سمندر بھر دیا

شرحِ غم ہوتی رہی رُخ کے بدلنے رنگ سے
ہے یہ ایسا اک ورق میں جیسے دفتر بھر دیا

آنکھ تھی ساقی کی جانب ہاتھ میں جام تھی
مے تو قسمت میں کہاں اشکوں نے ساغر بھر دیا

ہو اثر ظاہر تو پھر سمجھیں دوا وہ تھی کہ زہر
اتنا دیکھا تھا کہ کچھ زخموں میں لے کر بھر دیا

التجاؤں پر شبِ غم نیند آئی بھی تو یوں
دونوں آنکھوں میں اُچھل کر جیسے پتھر بھر دیا

غم کی اس ساقی گری کا دل ہے ممنون آرزوؔ
جس نے خالی جام کو ہر مرتبہ بھر بھر دیا

(۳۶)

آرزوئے وصل کو اِک نقشِ باطل کہہ دیا
کام کی ہمت نہ تھی بے سمجھے مشکل کہہ دیا

گم شدہ کی جستجو میں محویت کی حد ہوئی
سامنے جو شے نظر آئی اُسے دل کہہ دیا

منہ کا بھولا پن تو ہے معصومیت کا آئنہ
ایسا کیا دیکھا کہ دل نے اُس کو قاتل کہہ دیا

بدنصیبوں کے لئے ہے خشک و تر کا ایک حال
موج جو ٹکرا کے پلٹی رازِ ساحل کہہ دیا

تم ہوئے ابتک نہ میرے میں تمھارا ہو چکا
سارے قصہ میں جو تھا کہنے کے قابل کہہ دیا

ایک صورت کے ہزاروں ہو کے بھی یکدل نہیں
آئنے نے ٹوٹ کر نیرنگِ محفل کہہ دیا

کہتے ہیں وہ بات وہ کیا ہے کہ کہنے کی نہیں
بے زبانی تو نے سب افسانۂ دل کہہ دیا

دل کی ہمت سے زباں نا آشنا تھی آرزوؔ
پوچھنے کی بات کو بے پوچھے مشکل کہہ دیا

(۲۷)

ساتھ ہر ہچکی کے لب پر اُن کا نام آیا تو کیا
جو سمجھ ہی میں نہ آئے وہ پیام آیا تو کیا

مجھ کو بے دل کرکے جذبِ عشق کام آیا تو کیا
مر چکی پیاس اب اگر لبریز جام آیا تو کیا
مے سے ہوں محروم اب بھی گو شریکِ دور ہوں
پائے ساقی سے جو ٹھوکر کھا کے جام آیا تو کیا
کوئے جاناں میں پہنچ کر بھی نہ منزل طے ہوئی
آپ سے گزرے ٹھہرنے کا مقام آیا تو کیا
منھ کو ہر ہچکی میں آتا ہے کلیجہ آرزو
موت کا جس میں مزہ ہے وہ پیام آیا تو کیا

(۳۸)

ظرفِ خالی کو ٹھوکے دے کے کھنکانے سے کیا
مدعا بھی جب ہو کچھ پوچھو گے دیوانے سے کیا
بھاگتی ہے ہر قدم میری ہوا سے اڑ کے گرد
اب نکل جائے گی ویرانی بھی ویرانے سے کیا
بیخودی میں وہ تو اپنے سے بھی کوسوں دور ہے
لپٹا آتا ہے اگر سایہ تو دیوانے سے کیا
یوں جما ہی پر جما ہی توبہ توبہ کیا کہوں
ابر ہے یہ یا دھواں اٹھا ہے میخانے سے کیا

منھ سے کہنا اور شے ہے کر گزرنا اور بات
ختم ہے قصہ کہے گی شمع پروانے سے کیا
فکرِ خلوت خود مجھے تھی یادِ جاناں کے لئے
ہوش جاتا ہے تو جائے کام بیگانے سے کیا
کیا پسیج اُٹھا کبھی پتھر تو پھر پتھر نہیں
سنگ دل ہوتا ہے دو آنسو نکل آنے سے کیا
اک پہیلی ہے جسے سمجھا کرو بوجھا کرو!
بات کچھ مطلب ہے کچھ پوچھو گے دیوانے سے کیا
آتے آتے آنکھ تک پانی ہوا دل کا لہو!
شیشے سے انڈلا تھا کیا ٹپکا ہے پیمانے سے کیا
گھر کوئی زنداں نہیں رُکنا جھجکنا کس لئے
ساتھ پھر وحشت پلٹ آئی ہے ویرانے سے کیا
لہر پھر دل سے اُٹھی رگ رگ میں دوڑیں بجلیاں
دیکھئے کہتی ہے اب زنجیر دیوانے سے کیا
مانگنا اپنے قدح کی خیر ہے دستورِ خلق
خم لنڈھے ساقی تو ہم کو تیرے میخانے سے کیا

پردے محمل کے بنا نا تھے نظر گاہِ حجاب
ورنہ اک خانہ نشیں کو کام ویرانے سے کیا

ہجر کی شب داغِ دل اُبھرا ہے لَو دیتا ہوا
شمع بھی اُڑ جائے گی میرے سیہ خانے سے کیا

اُن کو جلدی آرزوؔ ہیں دم بخود اس سوچ میں
سب ہے کہنے کا کہوں کم کرکے افسانے سے کیا

(۳۹)

گر گیا نظروں سے غم جب آشکارا ہوگیا
نالۂ ناکام اک ٹوٹا ستارا ہوگیا

ذات ہے معشوق کی عاشق کی ساری کائنات
تم ہمارے ہوگئے سب کچھ ہمارا ہوگیا

عاشقی نے مست پلٹ دی حسن نے کھوئے حواس
اس نے جتنی دشمنی کی اور پیارا ہوگیا

دُکھ تو کیا ہمدم بٹا لیتے مگر اتنا ہوا
بیکسی یوں بات کرنے کا سہارا ہوگیا

آ گئے پردے کے باہر نکلے شوقِ عرضِ حال
جائیے بس کچھ نہیں مطلب ہمارا ہوگیا

بحرِ الفت کے شناور کیوں نہوں تھک تھک کے غرق
جتنے مارے ہاتھ دور اُتنا کنارا ہو گیا
نازنے جھلّا کے ٹھوکر ماردی اچھا کیا
خواب سے بیدار اک غفلت کا مارا ہو گیا
باتیں کرتا آدمی آٹھوں پہر چُپ ہے تو کیوں
غم نے بدلا بھیس پھر بھی آشکارا ہو گیا
آرزو دل بے تحمل آزمائش سخت گیر
ہائے رے بے اختیاری سب گوارا ہو گیا

(۴۰)

بے قدر کُھل کے رازِ دلِ زار ہو گیا
بادہ چھلک کے جام سے بیکار ہو گیا
کلفت میں دل بھی جذب سے بیکار ہو گیا
پڑ کر غبار آئینہ دیوار ہو گیا
شامل ازل سے درد ہے دل کے خمیر میں
اچھا ہی کون تھا کہ جو بیمار ہو گیا
دونوں کا اک مآل ہے افراط ہو کہ قحط
مو سے کو تلخ شربتِ دیدار ہو گیا

ہستی بشر کی دہر میں ہے چلتی پھرتی چھاؤں
مشتِ غبار سایۂ دیوار ہو گیا

پردے میں تیری یاد کے جب آچلی تھی موت
ہچکی اک آگئی کہ خبردار ہو گیا

ہے عکسِ نازِ حسن سکوتِ نیاز میں
بے بولے چاہے کون سا اقرار ہو گیا

کافر نظر نے ساز کیا جب سے آرزو
سینے میں دل کھٹکتا ہوا خار ہو گیا

(۴۱)

اے ہوائے جانفزا یہ خلد ہے یا کوئے دوست
لے رہا ہوں سانس پر سانس آرہی ہے بوئے دوست

بیقراری میں ہے اک تسکین بے چینی میں چین
دل کے جلنے سے بھی مجھ کو آرہی ہے بوئے دوست

شوق ہمت آفریں، ہمّت شکن ہے نازِ حسن
کھائی چتون کی چھری جب ہنس کے دیکھا روئے دوست

کیا چھٹے گا شوق کافر سے یہ پوشیدہ گناہ
دیکھ ہی لیتا ہوں آنکھیں بند کر کے سوئے دوست

کر رہا ہے جرأت جرم وفا معصوم دل
یہ کلی کھلنے سے پہلے دے رہی ہے بوئے دوست

ہیں الگ دونوں کی راہیں ہو کے اک منزل پہ بھی
آنکھ ہے کعبہ کی جانب دل ہے سوئے کوئے دوست

چاہے بخشے جانِ تازہ چاہے کٹوا دے گلا
زندگی و موت کیا اک جنبش ابروئے دوست

کیوں چھپیں تہذیب بزم ناز میں آداب شوق
سو بہانے کر کے مجھ کو دیکھ لینا سوئے دوست

اک ذرا خنجر کا رکنا اور رگڑ لینا گلا
خود دکھا اپنے تڑپنے میں جولاں قوتِ بازوئے دوست

آکے اپنے دشت میں تو ہوش کا دشمن ہے ہوش
سر ہے میرا آرزو اور تکیۂ زانوئے دوست

(۴۲)

دل بہ امید دوستی برباد
آدمی بہر آدمی برباد

وصل با ہجر جان تن مربوط
مرگ آباد زندگی برباد

بہر یکسوئی مزاجِ حیات
صد خرابات آگہی برباد

صورت نغمہائے موسیقار
سوز با ساز زندگی برباد

تا بہ کے انبساط لا یعنی عافیت خانہ خودی برباد
اے صدائے شکستِ عہدِ خموش دشمنی شاد دوستی برباد
بہ تمنائے وصل و خلوت دوست
کردی اے آرزو دوئی برباد

(۴۳)

چمن کا ذکر ہے اب غم کی داستاں صیاد
کہ نغمہائے خوشی بن چکے فغاں صیاد
بڑھا دی جوشِ رہائی نے قید کی سختی
ہوا تھا میرے پھڑکنے سے بد گماں صیاد
اب ان سے دل کو تسلی نہ بازوؤں ہی میں زور
کٹے پروں میں ہے کیا کردے رائگاں صیاد
بیان کرتا ہوں کچھ منہ سے کچھ نکلتا ہے
مری زباں سے نہ سن میری داستاں صیاد
بس اب وہ ہو کے رہے گا جو کچھ نصیب میں ہے
بچھا ہے دام نگاہوں سے ہے نہاں صیاد
یہ آشیانہ ہی اک دن قفس نہ بن جائے
بنا ہے میرے نصیبوں سے باغباں صیاد

نہ اک مذاق نہ اک جنس ہے نہ ایک زباں
ہوا ہے اور نہ ہوگا مزاج داں صیاد

بنا تھا پہلے وہی میرا قیدی بے دام
کہ مثلِ سایے کے تھا میں جہاں۔ وہاں صیاد

تم آئے آرزو اس مرغزار حسن میں کیوں
ہزار ہا ہیں جہاں بہر مُرغ جاں صیاد

(۴۴)

رہی نہ جائے سخن کوئی انفعال کے بعد
اثر زبان نے کھویا ہے عرض حال کے بعد

یہ ایک مُہر جفا ہے وفا کے محضر پر
نشانِ زخم بچاتا ہوں اندمال کے بعد

کلیم! برق بنے گا بھڑک کے شعلۂ حسن
رکھو اُمید رعایت نہ اشتعال کے بعد

اُمید دید ہیں ہم کو جلائے گی کب تک
وہ کل کہ ہوگی جہاں میں ہزار سال کے بعد

نہ ہوگی خس کی طرف بازگشت شعلۂ حسن
غم فراق کا کھٹکا نہیں وصال کے بعد

وہ جزر و مد ہے کہ جس میں ہے جوشِ بحرِ حیات
ملال بعد خوشی کے خوشی ملال کے بعد

جواب دینے کے بدلے وہ شکل دیکھتے ہیں
یہ کیا ہوا مرے چہرے کو عرضِ حال کے بعد

اداشناس نگاہوں نے ایسا کچھ دیکھا
جواب کی نہ تمنّا رہی سوال کے بعد

یہ سوچ کر کہ عبث تھی یہ سب عرق ریزی
پسینا آگیا ماتھے پہ عرضِ حال کے بعد

وہ ایک چاند ہے جس میں ہے جوت سورج کی
ترا کمالِ سخن آرزوؔ جلالؔ کے بعد

(۴۵)

اپنی بات اپنی نہ سمجھو تا بہ لب آنے کے بعد
راز افسانہ بنا منہ سے نکل جانے کے بعد

حُسن دلکش ہو اگر تو ہے خزاں میں بھی بہار
بوئے حسرت دے رہا ہے پھول کمھلانے کے بعد

مدتوں کے ضبطِ غم پر آج پانی پڑ گیا
رو دئے ہم اور بھی آنسو نکل آنے کے بعد

ہوں شہیدِ نازِ قاتل خوں بہا میرا یہ ہے
غیر فانی زندگی پائی ہے مرجانے کے بعد

ناتواں بیمارِ غم اس پر تھپیڑے موت کے
بجھ گیا آخر چراغِ صبح لہرانے کے بعد

کر چکا ناصح کو ساکت دے چکا شافی جواب
وہ سیانا جو سڑی بن بیٹھا سمجھانے کے بعد

ہاتھ ملنے کے سوا ہم آرزو اب کیا کریں
ہوش تو آیا مگر اُن کے چلے جانے کے بعد

(۴۶)

در دِ جب تک ہے ذرا سا موجود
زندگی کا ہے سہارا موجود

جو نہیں تھا اُسے پایا موجود
اور پھر یوں کہ ہر اک جا موجود

شرحِ بربادیٔ دل مجھ سے نہ پوچھ
ہے ترا حسنِ سراپا موجود

کیوں نہ ہو پردہ دریٔ شیوۂ عشق
حسن پردے میں ہے ہر جا موجود

کہتی ہے شرم عرق ریزیٔ عشق
ڈوب مرنے کو ہے دریا موجود

پردہ منظور ہو وحشت کا تو ہے
خاک اُڑتا ہوا صحرا موجود

کم نہیں کاوشِ ناخن تو ضرور
زخم میں ہے کوئی کانٹا موجود

داغِ غم یاد ہے مٹنا جس کا
ہے نہ ہونے پہ بھی گویا موجود

صدقے اس حُسن کی نیرنگی پر بے حجابی میں ہے پردا موجود
دل کہ سو بار مٹا الفت میں پھر ہو مرنا تو ہے زندا موجود
پردہ درشوق ہو بے پردہ ہو حُسن پھر بھی ہے آنکھ کا پردا موجود
آرزو تا بہ حرم کیوں گئے ہم
دیر میں کیا وہ نہیں تھا موجود

(۴۷)

یوں تو ہے تیغ نگاہ ناز کی دُنیا شہید
حُسن جس کا خوں بہا ہو کون ہے ایسا شہید
نور بھی تھا نار بھی تھی خاک کا پُتلا بھی تھا
کون نکلا قتل گاہِ ناز میں پہلا شہید
حُسن کی وہ بے نیازی وہ ندامت عشق کی
اپنا قاتل آپ ٹھہرا تیغ حسرت کا شہید
عشق بے تاب تمنا حُسن پابندِ حجاب
جھیلتا کب تک کشاکش ہوگیا پردا شہید
کشتۂ تیغِ ادا ہے بسمل تیرِ فراق
آرزو سا مردہ دل کہئے جسے زندا شہید

(۴۸)

بیخود نظّارہ ہیں اور کُل جہاں سے ہوشیار
ہوش پر بجلی گری رہتے کہاں سے ہوشیار

جب سے دل میں غم بیا گم ہے متاعِ صبر و ہوش
ٹھگ سمجھ لیتے تو رہتے میہماں سے ہوشیار

ہے نگاہِ باغباں میں آج بجلی کی چمک
ہم صفیرو اپنے اپنے آشیاں سے ہوشیار

ناخدا غافل ہے اور پلٹی ہوئی موجوں میں شور
پھر چکا ہے رُخ ہوا کا بادباں سے ہوشیار

شمع میں اے دل نہیں اخفائے رازِ غم کی خو
ایک ناداں دوست ہے اس ہم زباں سے ہوشیار

ہو جو پتھر بھی تو دو باتوں میں ہو جاؤ گے موم
آرزوؔ آتا ہے اس جادو بیاں سے ہوشیار

(۴۹)

خوف کیسا کر کے تکیہ مالکِ تقدیر پر
اک قصورِ تازہ ہے شرمندگی تقصیر پر

کب تھمی کوئی نقاب اُس روے پر تنویر پر
یوں چھنا پتھر کہ شیشہ بن گیا تصویر پر

خود مرا طولِ اسیری وجہ آزادی ہوا
زنگ بن کر قہر ٹوٹا آہنی زنجیر پر

ہے یہ از خود رفتگی قائم تو پھر کیسی دوئی
اپنا دھوکا ہو چلا ہے آپ کی تصویر پر

جائے ماتھے کی شکن ہم کو تو یہ دُھن آرزو
اور غصہ ان کا بڑھنا عذرِ بے تقصیر پر

(۵۰)

الزام خامشی کیوں، اُس ناز آفریں پر
بنتی ہے جنبش لب، آکر شکن جبیں پر

اُن کا جواب کب ہے، موقوف ہاں نہیں پر
جو بات جی میں آئی، خود لکھ گئی جبیں پر

اور دشمن تمنا، اس کا جواب دیجے
یہ ہاں بنے تو کیا ہو، مرتا ہوں جس نہیں پر

اخفائے غم کا پردہ، نامہ ہے شرح غم کا
آنکھوں سے اشک گم ہیں، دیکھے ہیں آستیں پر

دل آئنہ بنا ہے، حسن کرشمہ زا کا
سو نقش تہہ بہ تہہ ہیں، چھوٹے سے اس نگیں پر

وہ خون کرکے دل کا، کس حق سے مدعی ہیں
نقصان بھی ہمارا، الزام بھی ہمیں پر

نکلی شریک قسمت، بربادیٔ نشیمن
تنکے جہاں پڑے تھے، نوچے گئے وہیں پر

نیرنگیوں کے پردے، دھوکے میں ڈالتے ہیں
یہ سیکڑوں نقابیں، کیوں اک رخِ حسیں پر

پھیلا کے پاؤں سونا، کوئے وفا میں کیسا
آرام کی تمنا، تپتی ہوئی زمیں پر

جو کہہ کے بھولتا ہو، پھر انتظام اس کا
اے دل کی سادہ لوحی، صدقے ترے یقیں پر

دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر، تقسیم ہو رہا ہے
دھوکے میں تیرے ظالم، مرتا ہوں ہر حسیں پر

قول و قسم کی خاطر، شمع وفا بنا ہے
خود حسن، آگ رکھ کر، اک دستِ نازنیں پر

سوز و گداز پر ہے، الفت کی کامیابی
چلتی ہے کشتیٔ دل، سیلابِ آتشیں پر

مثلِ چراغِ کشتہ، روشن گرِ وفا ہوں
سو بار اگر ہو جینا، مرنا ہے پھر یقیں پر

راہِ وفا کا سالک، ہے پاک گردِ رہ سے
پتھر پہ نقشِ پا ہے، سایہ نہیں زمیں پر

ہے آرزو کو نفرت، اس کج روی سے ورنہ
اُس کو بھی حرف رکھنا، آتا ہے نکتہ چیں پر

(۵۱)

بہت دل لبھایا دل آزار ہو کر
کھلے پھول بن کر چبھے خار ہو کر

کوئی التجا کیسی خود دار ہو کر
مگر کیا کریں دل سے ناچار ہو کر

زباں کو تو یارا نہیں ذکرِ غم کا
کچھ آنکھیں ہی کہہ جائیں خونبار ہو کر

پسِ ہوش نکلے ملامت کے طوفاں
پھر اس پار پلٹا ہوں اُس پار ہو کر

رسائی کا اُن تک نہ تھا کوئی حیلہ
بہت خوش ہے مجرم گرفتار ہو کر

محبت مرض در مرض ہے کہ دل کو
دوا سے ہے پرہیز بیمار ہو کر

یہ نذرانۂ عرضِ حال اللہ اللہ
کہے کچھ تو مرنے پہ تیار ہو کر

پہنچتے ہیں ان تک پہنچ جانے والے
تہِ تیغ ہو کر سرِ دار ہو کر

گلا اپنا، ہاتھ اپنا، تلوار اپنی
یہی ایک چارہ ہے ناچار ہو کر
خجالت کی آئینہ بندی ہے ہر سو
کدھر جاؤں اپنے سے بیزار ہو کر
دیت خوں کی سُن کے آساں ہے مرنا
وہ خود بک رہے ہیں خریدار ہو کر
حدِ درد پا لے گی کیا چارہ سازی
دوا روز پھنکتی ہے تیار ہو کر
جو بے لوث ہو جائے کیوں اُس گلی میں
کچل دے گا سایہ بھی دیوار ہو کر
کلام خودی آرزو بیخودی میں
چھلکنے لگا ظرف سرشار ہو کر

(۵۲)

آفت میں پڑے درد کے اظہار سے ہم اور
یاد آ گئے بھولے ہوئے کچھ اُس کو ستم اور
تاخیر کی بنیاد ہے خود عجلت بے جا
جلدی ہے جو لکھنے کی تو رکتا ہے قلم اور
جو بات ہے کل کی اُسے اب کہہ نہیں سکتے
ہاں آج تو یہ سچ ہے کہ تم اور ہو ہم اور
ہستی کو عدم سے ہے ملائے ہوئے ہر سانس
کھولو نہ کمر کو کہ ہے وقفہ کوئی دم اور

اک فرقِ مسمیٰ ہے اگر اس کو مٹا دو
ہستی ہے کوئی شئے نہ جدا اور نہ عدم اور

ناصح کی ملامت پہ ہوں خاموش کہ آخر
کچھ میں بھی جو کہتا ہوں تو کھلتا ہے بھرم اور

بہلانے کو دل عیش گزشتہ نہ برا تھا
لیکن یہ نہ سمجھے تھے کہ بڑھ جائے گا غم اور

جانکاہیوں میں ہجر کی دے سکتی ہے کیا ساتھ
یہ عمر دو روزہ کہ ہوئی جاتی ہے کم اور

زاہد مرے دامن پہ نہ رکھ مفت کی تہمت
ہاتھ اور پسیجے گا تو ہو جائے گا نم اور

اس دل شکن انکار کا انجام ہے اقرار
ہاں ترکِ محبّت کی قسم ایک قسم اور

ہم آرزو اِس شان سے پہنچے سرِ منزل
خود لغزشِ پا لے گئی دو چار قدم اور

(۵۳) ✓

قول اور ہے فعل اور ہے دل اور زباں اور
اُس عہد شکن کی ہے نہیں اور نہ ہاں اور

دل جلنے میں ہے دمِ بخودی آفتِ جاں اور
ہوتی ہے ہوا بند تو گھٹتا ہے دھواں اور

اے ہمتِ اخفائے غم اللہ نگہباں
دل درد کے تھم جانے سے ہوتا ہے تپاں اور

کمزور کا غصہ ہے مرا اُن سے بگڑنا
خود پیچ سے ٹوٹے گی کھنچے گی جو کماں اور

آفت تھا یونہی تذکرۂ عشق فسوں کار
کرتا ہے غضب اس پہ ترا حسنِ بیاں اور

ذروں کے اُبھرنے کی کریں فکر نہ موجیں
بنتے ہیں نئے نقش کے مٹتا ہے نشاں اور

دلواؤ نہ ضد جیب سے بہتر ہے مروت
کٹتی ہے اگر بات تو چلتی ہے زباں اور

پردے کی لگاوٹ میں امانت کا ہے دھڑکا
دل چھین نہ لے جائے کوئی آفتِ جاں اور

پھولوں کی مہک قہر ہے سبزے کی لہک زہر
بڑھ جاتا ہے کچھ سیرِ چمن سے خفقاں اور

پیمانہ ہے چھلکا ہوا اور جی نہیں بھرتا
قابو میں نہیں پھر بھی زباں پر ہے کہ ہاں اور
کڑیاں نہ بڑھا قید کی او کوشش ناکام
تھکنے سے ہوئی جاتی ہے زنجیر گراں اور
تنگ آکے ترے جور سے دل پر جو نظر کی
پہلو ہی میں آیا نظر اک آفت جاں اور
گہوارہ بنے زلزلے دنیائے دفا کے
غفلت میں جو تھا اس کا ہوا خواب گراں اور
پھر شام نہ اب دیکھیں گے اے آہ سحرگاہ!
جلنے کا دھواں اور ہے بجھنے کا دھواں اور
تلوار کا جو ہر ہے مرے خون کا دھبّا
اے آرزو ابھرے گا مٹانے سے نشاں اور

(۵۴)

دل خوش ہے شکوۂ غم پنہاں کئے بغیر
تخفیف درد ہو گئی درماں کئے بغیر
پردے کو دل کے چین جبیں کر رہی ہے فاش
رسوا ہوا ہوں چاک گریباں کئے بغیر

حکمِ طلب کے بعد نہیں جائے دم زدن
جانا پڑا ہے کوچ کا ساماں کئے بغیر

کس حق سے پھر جفا ہے جو مجھ میں وفا نہیں
او حیلہ جو بنے گی نہ اب ہاں کئے بغیر

ہاں ہاں بجا ہے برّشِ تیغِ ادا پہ ناز
لیکن نہ امتحانِ رگِ جاں کئے بغیر

دل میں ہے سوزِ عشق تو کیا شامِ غم کا خوف
خود شمع جل اُٹھے گی فروزاں کئے بغیر

اتنا تو کوئی پوچھ لے کیا آئے کیا چلے
مشکل کو اک غریب کی آساں کئے بغیر

کہنا بھی اوچھا پن ہے اور اظہارِ غم بھی فرض
چارہ نہیں ہے حال پریشاں کئے بغیر

ہنگامہ خیز خود ہے یہ ہستی کہ آرزو
فتنے ہزار اُٹھتے ہیں ساماں کئے بغیر

(۵۵)

کیا کروں ظاہر کسی پہ دل کی بیماری کا راز
ہے اسی پردے میں سب تیری ستمگاری کا راز

دیکھ ہمدم حالتِ دل نام قاتل کا نہ پوچھ
کیوں ہو بنیادِ رقابت تیری غمخواری کا راز

دل کی خاکستر کے ذرّے اُڑ چلے بن کر شرار
آج ظاہر ہو گیا جاں سوز چنگاری کا راز

میرے سوزِ دل کی حالت کیا چھپا سکتی تھی شمع
ایک بے قابو زباں اور غم کے آزاری کا راز

داغ ہے ہر عزیزاں کو فت بہر چارہ ساز
موت آنے تک نہ کھلنا دل کی بیماری کا راز

ہاں مری قاتل ہے فرقت کی یہی خاموش رات
کیوں کہے گا خودکوئی اپنی سیہ کاری کا راز

شب میں شامل تھا سوادِ زلفِ مشکیں آرزو
میری آنکھیں جانتی ہیں اپنی بیداری کا راز

(۵۶)

کل صُراحی کی تھی مٹی اب ہے پیمانے کی خاک
اپنی حد میں کروٹیں لیتی ہے میخانے کی خاک

دوریٔ منزل سے ہے واماندگی بھی شوق بھی
بیٹھتی اُٹھتی چلی جاتی ہے دیوانے کی خاک

چلتے ہی بادِ بہاری ہو گیا میدان صاف
تھی مگر زنداں کی دیواروں میں ویرانے کی خاک

جذبِ کامل کی بدولت اُٹھ گیا فرقِ دوئی
اب بجائے شمع لو دیتی ہے پروانے کی خاک

کرتی ہے تقسیم عالم بھر میں لے لے کر صبا
یہ تبرک بن گئی کس کے عزا خانے کی خاک

دیکھ لینا وادیٔ وحشت سے تا میدان حشر
آگے آگے ناقہ پیچھے پیچھے دیوانے کی خاک

ہے وفا سے بڑھ کے معشوقوں کو خودداری عزیز
شمع سے کیونکر سمیٹی جائے پروانے کی خاک

تو بہ ٹوٹے شان سے دل صاف ہے زاہد اگر
پونچھ لے گوشے سے سجادے کے پیمانے کی خاک

زلزلوں سے قبر ٹوٹی قبر سے آندھی اُٹھی
قید ہو کر رہ نہیں سکتی ہے دیوانے کی خاک

آنسوؤں نے شمع کے سب جوش ٹھنڈا کر دیا
بیٹھی ہے اُڑنے کی طاقت کھو کے پروانے کی خاک

آرزو اب کس جگہ روئیں کہاں آنسو بہائیں
ایک کردی آسماں نے اپنے بیگانے کی خاک

(۵۷)

جو وجہ اشتعال ہے اُس فتنہ گر کو روک
الزام مجھ پہ کس لئے اپنی نظر کو روک

شوخی نظر کی دل کا بڑھاتی ہے اضطراب
منظور رفع شر ہو تو اس فتنہ گر کو روک

طوفانِ غم کے واسطے کمزور سد ہے ضبط
آندھی سیہ رُکی ہو تو دودِ جگر کو روک

دبنے پہ بھی اس آنچ کی گرمی ہے برقرار
نالہ تو میں نے روک لیا تو اثر کو روک

ہر سانس ضبطِ غم سے بنی آہ آرزو
قابو ہے کچھ تو پھیلنے والی خبر کو روک

(۵۸)

مانگ جو کھو کے آن بان نہ مانگ
قتل ہو جا مگر امان نہ مانگ

دیکھ پیماں شکن زبان نہ مانگ
بعد کو پھیر دے کے جان نہ مانگ
صرف اُس کی خوشی میں سب کچھ ہے
ایک شے مانگ دو جہان نہ مانگ
روح پرور ہے کاہشِ غمِ دل
موت نا ہو ہو کے بدگمان نہ مانگ
ظلم سے بھاگتے نہیں حق کو
وار کافی ہے ریسمان نہ مانگ
دینے والے سے تو ہے کم ہمت
خود اُسے مانگ بے جہان نہ مانگ
جان کر جان دی نہیں جاتی
ہوں وہ معنی بات کا زبان نہ مانگ
بے دلی میں دکھاؤں دل کیونکر
نہیں جو شے وہ میری جان نہ مانگ
آرزو یہ طلب ہے بے معنی
ہند میں رہ کے اصفہان نہ مانگ

(۵۹)

دہشت میں خمار فردا کی
مے پھینک نہ دیں گے جام سے ہم
اُمید سحر میں کیوں بیٹھیں
گل کر کے چراغ کو شام سے ہم
کھنچ بیٹھنے پر آگاہ ہوئے
آغاز ہی میں انجام سے ہم
پھر چھیڑ اُدھر سے ہونے لگی
اب بیٹھ چکے آرام سے ہم
آرام میں تھا پہلے بھی خلل
ہیں بعد رہائی بھی بے کل
پر ٹوٹ گئے بازو ہوے شل
نکلے جو پھڑک کر دام سے ہم
ہو لذتِ بیم کہ لطفِ رجا
دل میں ہے ٹھکانا ایک ہی کا
دو بادے ہیں جب اور کیف جدا
پی سکتے نہیں اک جام سے ہم

پائی تری حد اے دورِ محن،
حاصل ہے سفر میں لطفِ وطن
منزل ہے یہاں رستے کی تھکن،
بیٹھے ہیں بڑے آرام سے ہم

وہ عمر کی مدت ہی کتنی،
جو سانس کی آمد و شد پر تھی
کُل منزلِ ہستی طے کر لی،
آگے نہ بڑھے اک گام سے ہم

دل رہنے والی چیز نہ تھا،
حق ہوتا تلف حق والے کا
کر دیتے تمھیں پر گر نہ فدا،
بچ سکتے نہ تھے الزام سے ہم

دہشت ہے ہولِ قیامت کی،
جو قبر میں بیٹھ نہیں لگتی
اک مرتبہ اور اُٹھنا ہے ابھی،
سوئیں کیا خاک آرام سے ہم

اک جھوٹی امید کے لالچ میں،
ہونا ہے کہ اور ایذا جھیلیں
دل بیٹھا ہوا اور ضد یہ ہمیں،
لیں کام اِسی ناکام سے ہم
دینا جو نہیں تو نہ اصلا دو،
بخشش کی ادا ہی دکھلا دو
اک بھر کے ادھر بھی لنڈھکا دو،
چھک جائیں گے خالی جام سے ہم

خود کام کبھی، ناکام کبھی ، اور آرزوؔ بدنام کبھی
اللہ پکارے جاتے ہیں ، اُس بزم میں کس کس نام سے ہم

(۶۰)

محروم کیوں ہوں دشت میں سیرِ چمن سے ہم
نکلے ہیں سُرمہ لے کے سوادِ وطن سے ہم
دارالقضاکے لوگ سخن ناشناس ہیں
حق کہہ کے بھی بچیں گے نہ دار و رسن سے ہم
اِک دل ہی تھا غریب کا سرمایۂ حیات
شرمندہ اُٹھ رہے ہیں تری انجمن سے ہم

آلودگیِ گردِ طمع سے خدا بچائے
جاتے ہیں جھاڑتے ہوئے دامن چمن سے ہم

اوروں پر اپنا بوجھ نہیں ڈالتے شہید
مرنے پہ بے نیاز ہیں غسل و کفن سے ہم

پابندیِ رضا نے لگا دی ہے منھ پر مُہر
ہر بات اب کہیں گے تمھارے دہن سے ہم

حُسنِ طلب یہ وہ ہے کہ سو دل نثار ہیں
اک پھول مانگتے ہیں تمھارے چمن سے ہم

عریاں تنی میں سب کا ہے اک حشر آرزو
ہوتا تو دیتے پھاڑ کے ٹکڑے کفن سے ہم

(۶۱)

مری نگاہ کہاں، دیدِ حسنِ یار کہاں
ہوا عتبار تو پھر تابِ انتظار کہاں

دلوں میں فرق ہوا جب تو چاہ پیار کہاں
چمن چمن ہی نہیں آئے گی بہار کہاں

جسے یہ کہہ کے وہ ہنس دیں کہ قصہ اچھا ہے
وہ راز کھل کے بھی ہوتا ہے آشکار کہاں

اُمنگ تھی یہ جوانی کی یا کوئی آندھی
ملا کے خاک میں ہم کو گئی بہار کہاں

امیدوار بنانے سے مدعا کیا تھا
جب آس تم نے دلا دی تو اب قرار کہاں

ملی ہے اس لیے دو چار دن کی آزادی
کہ صرف کرتا ہے دیکھیں یہ اختیار کہاں

جگہ ہے روز نئی شکلِ خاکِ ریگستاں
جہاں میں دفن ہوا تھا وہاں مزار کہاں

یہ شوق لے کے چلا ہے چمن سے شکلِ نسیم
کہ دیکھیں ملتی ہے جاتی ہوئی بہار کہاں

کہاں زبان کا اقرار اور کہاں دیدار
ہزار دیں وہ تسلی مجھے قرار کہاں

ہے ایک شرطِ وفا کی وہ قیدِ بے زنجیر
سب اختیار ہیں اور کچھ بھی اختیار کہاں

مٹے نشاں پہ نظر کر کے رو جسے چاہے
ترے ستم کی ہے تربت مرا مزار کہاں

تم ایسا عہد شکن آرزو سا نا امید
کہو جو سچ بھی تو آتا ہے اعتبار کہاں

(۶۳)

ہیں یہی ساقی جو بے پروائیاں
توڑ دیں گی بند بند انگڑائیاں
عشق پر بھی چھا گئیں رعنائیاں
اُف تری توڑی ہوئی انگڑائیاں
پرتوِ خلوت ہے جلوت کا طلسم
دوڑی دوڑی پھرتی ہیں پرچھائیاں
آئینہ دل کا مکدر ہے کہ صاف
دیکھ لے چہرہ کی اپنے جھائیاں
کھول دیں گی دل کا پوشیدہ لگاؤ
ان کو شرما کر مری رسوائیاں
باہر آتا ہے کہاں وہ خلوتی
سب ہیں امیدوں کی بزم آرائیاں
کیا بچے دل متّرکتا زِ حسن سے
ختم ہیں اِک چوٹ پر سب گھائیاں

کثرتِ وحدت ہے نیرنگِ جمال
جتنے شعلے اتنی ہی پرچھائیاں
عشق کوئی کھیل لڑکوں کا نہیں
جو سبھی چھو آئیں جاکر دھائیاں
آرزو ضد میں بنی ہیں دھوپ چھاؤں
میری چاہ اور ان کی بے پروائیاں

(۶۳)

ہشیار بھی ہوں دیوانہ بھی
خاموش ہوں اور سر دھنتا ہوں
ہوں اندھا اور سب دیکھتا ہوں
ہوں بہرا اور سب سنتا ہوں
اِس نفع میں کچھ نقصان نہیں
یہ سود زیاں سے خالی ہے
سب شاخ سے توڑتے ہیں کلیاں
اور خاک سے پھول میں چنتا ہوں

(۶۳)

نظر اُس چشم پہ ہے جام لئے بیٹھا ہوں
ہے نہ پینے کا یہ مطلب کہ پئے بیٹھا ہوں

تم کو غارت گری دل کا اب آیا ہے خیال
اور میں پہلے ہی سے صبر کئے بیٹھا ہوں

رخنہ اندازیِ اندوہ سے غافل نہیں میں
ہے جگر چاک تو کیا ہونٹ سئے بیٹھا ہوں

کیا کروں دل کو جو لینے نہیں دیتا ہے قرار
جو مقدر نے دیا ہے وہ لئے بیٹھا ہوں

التفات اے نگہِ ہوشربا اب کیوں ہے
پاس جو کچھ تھا وہ پہلے سے دئے بیٹھا ہوں

دلِ پُر کیف سلامت کہ اکیلے میں بھی
ایک بوتل سے بغل گرم کئے بیٹھا ہوں

آرزوؔ جلتے ہوئے دل کے شرارے ہیں اشک
آگ پانی کے کٹوروں میں لئے بیٹھا ہوں

(۶۵)

دل میں یادِ بتِ بے پیر لئے بیٹھا ہوں
یعنی اِک ظلم کی تصویر لئے بیٹھا ہوں
آہ میں درد کی تاثیر لئے بیٹھا ہوں
دل میں اِک خون بھرا تیر لئے بیٹھا ہوں
اک زرا سی خلشِ دردِ جگر پر یہ گھمنڈ
جیسے کل عشق کی جاگیر لئے بیٹھا ہوں
ہے مجھے سازِ طرب سوختہ سامانیِ دل
پردۂ خاک میں اکسیر لئے بیٹھا ہوں
چور شیشے پہ نظر پڑتے ہی دل یاد آیا
ٹوٹنے والے تری تصویر لئے بیٹھا ہوں
قید کو توڑ کے سمجھا کہ سہارا توڑا
ہاتھ میں پاؤں کی زنجیر لئے بیٹھا ہوں
آرزوؔ ہو چکی سو مرتبہ دنیا بیدار
اور میں سوئی ہوئی تقدیر لئے بیٹھا ہوں

(۶۶)

ظرفِ ہوس ہوں دستِ گداگر میں قید ہوں
گردش ہے کُل جہان کی اور گھر میں قید ہوں
زندان بھی وسیع ہے زنجیر بھی دراز
آزادیِ خیال کے چکر میں قید ہوں
مُرغِ شکستہ پر کو نشیمن ہی ہے قفس
دروازہ ہے کھُلا ہوا اور گھر میں قید ہوں
بے حل پڑا ہے مسئلۂ جبر و اختیار
مدت ہوئی کہ محبسِ بے در میں قید ہوں
وضعِ گدا کو داغ ہے تبدیلیِ لباس
میں خاکسار ایک ہی چادر میں قید ہوں
کیفِ خمار وہ ہے کہ سرمستیاں نثار
میں کیوں فریبِ شیشۂ و ساغر میں قید ہوں
باہر ہیں اختیار سے امکان کی حدیں
یارب یہ کیسے دشت نما گھر میں قید ہوں
سو رنگ حسن کے ہیں تو سو بھیس عشق کے
جب دیکھتا ہوں اِک نئے پیکر میں قید ہوں

آزاد چھٹ کے بھی ہے کہاں ناتواں اسیر
بیڑی کٹی تو اپنے ہی لنگر میں قید ہوں
اے آرزو لطافتِ حسنِ بیاں کی طرح
ہوں بوئے خوشگوارِ گلِ تر میں قید ہوں

(۶۷)

میں روکشِ دو رنگیِ لیل و نہار ہوں
آتی ہوئی خزاں ہوں نہ جاتی بہار ہوں
مجھ سا سیاہ کار کہاں اور کہاں بہشت
آئینہ دارِ بخششِ آمرزگار ہوں
اپنی ہوائے شوق ہے منزل سے بیخبر
جو بیٹھتا نہیں وہ پریشاں غبار ہوں
ہستی ہے گرد باد کی منزل سے بے نیاز
اِک خانماں بدوش غریب الدیار ہوں
بلبل کا ہم زبان ہوں یہاں میں بھی آرزو
یعنی فریب خوردۂ رنگِ بہار ہوں

(٦٨)

بسمل ہوں تو میں ہوں متحمل ہوں تو میں ہوں
خود اپنے لئے باعثِ مشکل ہوں تو میں ہوں

کہتا ہے یہ اُس حسنِ نظر سوز کا شعلہ
محمل ہوں تو میں صاحبِ محمل ہوں تو میں ہوں

دل شمع سا جلتا ہوا پہلو میں ہے کس کے
محفل میں اگر رونقِ محفل ہوں تو میں ہوں

دیوانے کو پابندیِ آداب نے مارا
اپنے دلِ وارفتہ کا قاتل ہوں تو میں ہوں

ہے آرزو انعام یہ سرکار جنوں کا
پھر اُترے ہوئے طوق کے قابل ہوں تو میں ہوں

(٦٩)

نمونہ جورِ گردوں کا نشانِ خستہ حالی ہوں
تبر جس پر چلے ہیں درد و حسرت کی وہ ڈالی ہوں

مرا ہنسنا ہے دنیا میں چراغِ صبح کا ہنسنا
سنبھالا لے کے جو مرتا ہے اس رخ کی بحالی ہوں

شفق کی طرح شاہد آپ اپنے خونِ ناحق پر
پسی مہندی سے جو ہوتی ہے پیدا وہ میں لالی ہوں

مری ناکامیاں روتی ہیں خود میری جوانی پر
ہوں اِک جام تمنا اور مے عشرت سے خالی ہوں

جہاں میں آرزو ہونا نہ ہونا میرا یکساں ہے
نگاہوں کے لئے دھوکا ہوں تصویرِ خیالی ہوں

(۷۰)

کہئے شکوے کو تو ہاں قابلِ اظہار نہیں۔
کیجئے شکر وہ اس کا بھی روا دار نہیں

کیوں ہو پابندِ تعیّن مری پروازِ خیال
مرد آزاد کوئی مرغ گرفتار نہیں

اُن کی بے جا بھی سنوں آپ بجا بھی نہ کہوں
آخر انسان ہوں میں بھی کوئی دیوار نہیں

نام منصور کا قسمت نے اُچھالا ورنہ
ہے یہاں کون سا حق گو کہ سر دار نہیں

لا دوا درد نے بخشی ہے حیاتِ ابدی
اب تو مرنے کے بھی قابل ترا بیمار نہیں

زر کوئی مال نہیں حسن کی قیمت دل ہے
میں تو بکتے ہوئے یوسف کا خریدار نہیں
آرزو شیوۂ اربابِ صداقت ہے یہی
حق پہ دشنام بھی سننے میں کوئی عار نہیں

(۷۱)

ہم مر رہے ہیں اور وہاں کچھ اثر نہیں
قاتل ہوں میں چھری کو خود اس کی خبر نہیں
یہ کوئی زندگی ہے کہ مرتے ہوئے ہمیں
برسوں گزر گئے ہیں پہر دو پہر نہیں
عہدِ وفا پہ لے کے قسم ایک خود غرض
ممکن تو ہے کہ ہاں ابھی کہہ دے مگر نہیں
اس دل کی وجہ سے ہے تم اپنا چکے جسے
وہ ایک بے بسی کہ اِدھر ہے اُدھر نہیں
جب بیٹھنے نہ پائے تو کھانے کو ٹھوکریں
دنیا پڑی ہے ایک تری رہ گزر نہیں
اپنی لپک بڑھا دے اب اے شعلۂ جمال
پروانہ بن گیا ہوں اور اڑنے کو پر نہیں

بے سود زندگی کی ہے بے لطف ایک سانس
وہ آہِ نامراد کہ جس میں اثر نہیں
اے شوق پڑھ دے دل کی امیدوں پہ فاتحہ
لاکھوں پیام اور کوئی پیغامبر نہیں
وہ قتلِ عام پر بھی ہیں الزام سے بری
کیا کر رہا ہے حسن انھیں کچھ خبر نہیں
زنداں ہے کیا بلا ترے قیدئ عشق کا
جانے کو جس میں در ہے نکلنے کو در نہیں
عاشق کی نامراد جوانی ہے آرزو
وہ آہ جس کا شور بہت اور اثر نہیں

(۷۲)

جنگ جوئی مایۂ صبر و رضا ہوتی نہیں
ہر زمیں بننے سے مقتل کربلا ہوتی نہیں
درد کا کیا ذکر جو گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے
دیکھنا یہ ہے کہ بے چینی سوا ہوتی نہیں
اُف رے پاسِ نازبرداری گلا کٹنا قبول
دور ہو سر سے مصیبت یہ دعا ہوتی نہیں

زیرِ خنجر بندھتی ہے نیت ادائے فرض کی
یہ نمازِ عاشقی ہے جو قضا ہوتی نہیں

بے مرے زندہ نہ ہونگی یہ سسکتی حسرتیں
انتہا جب تک نہووے ابتدا ہوتی نہیں

اس سے سکھ پائے گی دنیا بے غرض جو دکھ اٹھائے
خاکِ حسرت آرزو خاکِ شفا ہوتی نہیں

(۷۳)

سپید و سیاہ ایک ہی ہیں تو سمجھو نظر نظر ہی نہیں
غضب ہے سیاہ خانہ مرا۔ کہ جس کی سحر سحر ہی نہیں

کرم نہ کریں بجائے ستم ستم ہی کریں۔ بجائے کرم
بنا لیا دل کو خوگرِ غم۔ تو کوئی ضرر ضرر ہی نہیں

جو دیکھ کے چپ ہوئے بھی تو کیا۔ جو پوچھ کے رو دیے بھی تو کیا
نہ کی گئی جب تسلیِ دل۔ تو کوئی اثر اثر ہی نہیں

جفا سے جو دے جواب وفا۔ اور اُس پہ نہ آنکھ جھینپے ذرا
بشر ہی سے ہوتی ہے یہ خطا۔ تو ایسا بشر بشر ہی نہیں

پہنچنے پہ کچھ نہیں ہے محن۔ جو کچھ ہے سو راستہ ہے کٹھن
ارے یہ ہے بازگشتِ وطن۔ عدم کا سفر سفر ہی نہیں

جو ساغرِ چشم میں ہے یہ مے۔ تو سازِ دل کے درد کی لے
ہر ایک جگہ ہے اک نئی شے۔ یہ غم کا شرر شرر ہی نہیں
صفائے دلی پہ کر تو نظر۔ اس آئینے میں ہے آئینہ گر
ہے ویسا ہی رنگ روپ اِدھر۔ جو کچھ ہے اُدھر اُدھر ہی نہیں
یہ پھر نہ کھلا جو چشم تھی تر۔ کہ غم کا تھا یا خوشی کا اثر
کچھ آرزو اس کا سوچ نہ کر۔ ابھی یہ خبر خبر ہی نہیں

(۷۳)

ہاں ابھی مقبول اپنی ناصیہ سائی نہیں
ایک بھی پتھر پہ ماتھے کی لکیر آئی نہیں
شوقِ بے بنیاد کی دیوانگی کو کیا کہوں
ڈھونڈھتا ہے دل اُسے جس سے شناسائی نہیں
حُسن کو قاتل بنایا عشق ایذا دوست نے
دل پہ بے چرکا لگے لب پر ہنسی آئی نہیں
تھا حریفِ خلوتِ جاناں خودی کا امتیاز
آنکھ جب کھولی یہی دیکھا کہ تنہائی نہیں
میرا حصہ مجکو بھی دے اے جمالِ ضو فشاں
بڑھ رہا ہے شوقِ دید آنکھوں میں بینائی نہیں

شوق کے تاریک رستے میں پڑا ہے گل چراغ
دل ہے واقف آنکھ کہتی ہے شناسائی نہیں

حُسن نے کیوں رکھ دیا ہے جبر کا نام اختیار
بے بسی سے قید ہیں نظریں تماشائی نہیں

پردہ ڈالا رازِ دل پر عشق نے بن کر جنوں
اب گریباں چاک ہو جانے میں رسوائی نہیں

کاٹنا ہے راستے کے نام سے میعادِ زیست
شغلِ بے کاری سمجھ تو دشت پیمائی نہیں

ساتھ کیا تاروں کا دیں تا صبح کم روغن چراغ
دیدۂ یعقوب میں یوسف کی بینائی نہیں

آرزو دم مارنے کی جا نہیں ہے چپ رہو
ہیں وہ ہرجا پھر یہ کہتے ہیں میں ہرجائی نہیں

(۷۵)

زور آئے گا ہوا بھرنے سے غم کے ساز میں
اتنے دن چپ رہ کہ آ جائے اثر آواز میں

وقتِ آخر چلتے چلتے سانس بھی عاری ہوئی
ساتھ دے مرنے کا اتنا دم نہ تھا دمساز میں

عشق کی دنیا میں اُلٹا ہے نظامِ مرگ و زیست
ہے بقا انجام میں جس کے فنا آغاز میں
صور کے پردے میں کس نے روحِ تازہ پھونک دی
جاگ اُٹھے برسوں کے سوئے ایک ہی آواز میں
اس جہانِ عنصری میں ہے قفس اندر قفس
چھوڑ دینا تھا نشیمن پہلی ہی پرواز میں
آرزو لائی صبا شاید نویدِ فصلِ گل
آہ جب بلبل نے کی پیتی لگی آواز میں

(۷۶)

امانت ہے اساسِ زندگی شعلے کا روغن میں
پناہ آ آ کے بجلی لیتی ہے میرے نشیمن میں
چھری صیاد کی اچھی۔ برا ہے دام کا پھندا
کہ رہنا بھی اسی گلشن میں مرنا بھی ہے گلشن میں
ہوس اندھا بنا کر قتل کا سامان کرتی ہے
فریبِ نفس ہے۔ سیتا کہاں آغوشِ راون میں
وہاں اک دل لگی مبہم سی کوئی بات کہہ جانا
یہاں بیٹھے بٹھائے صبح ہو ہو جانا الجھن میں

یہ فانی زندگی خود کاٹتی رہتی ہے طول اپنا
نفس کا ہے کو ہے چلتی چھری رکھی ہے گردن میں

کبھی چاک اُنکے ہاتھوں کے کچھ آنسو اپنی آنکھوں کے
دیا ہے جو مقدر نے لیئے بیٹھا ہوں دامن میں

جہاں کے انقلابوں سے ہے زندہ میری بیتابی
ابھی تک کروٹوں پر کروٹیں ہیں کُنجِ مدفن میں

شہیدِ ناز ہو کر جی رہا ہوں صورتِ ماہی
نشان اے آرزو طوقِ اطاعت کا ہے گردن میں

(۷۷)

اُن کی صورت کو دیکھتا ہوں میں
اپنی قسمت کو دیکھتا ہوں میں

آسرا ٹوٹنے پہ بھی وہی چاہ
دل کی ہمت کو دیکھتا ہوں میں

کبھی تلخی پہ صبر کی ہے نظر
کبھی لذت کو دیکھتا ہوں میں

آپ سے خود گزر کے اپنے میں
خود بدولت کو دیکھتا ہوں میں

جبر اُٹھوا کے وقت سے پہلے
دل کی طاقت کو دیکھتا ہوں میں
جو محبّت کرے وہ مارا جاے
رسمِ اُلفت کو دیکھتا ہوں میں
خود بھی لیتا نہیں ستمگر چین
اِس عداوت کو دیکھتا ہوں میں
آرزوؔ حور پر مرے زاہد
آدمیّت کو دیکھتا ہوں میں

(۷۸)

مقصد اپنا کہ آپ کا ہوں میں
کچھ ابھی طے نہیں کہ کیا ہوں میں
ہو کے خود گم کہاں گیا ہوں میں
اب تو کچھ بار یاب سا ہوں میں
کھو کے خود کس کو پا گیا ہوں میں
دُکھ میں ہوں اور ہنس رہا ہوں میں
ہائے رے برزخِ اُمید و بیم
روز مر مر کے جی رہا ہوں میں

کہدیا اتنا آگے سوچئے خود
ہوں برا بھی تو آپ کا ہوں میں
دست کش خود ہوں سمٹے دامن سے
اپنی عادت کو جانتا ہوں میں
جتنی نیرنگیاں ہیں پیشِ نگاہ
ان کو بھی وہم جانتا ہوں میں
غرض اے چشم التفات نہ پوچھ
بات دل کی سمجھ رہا ہوں میں
عقل سے بیر ہوتا جاتا ہے
دل کے قابو میں آچلا میں ہوں
وہ تو کچھ مسکرا کے ہو گئے چپ
ایک الجھن میں پڑ گیا ہوں میں
زندگی سدِ راہِ شوق ملی
اب ارادہ بدل رہا ہوں میں
ہوگی ہر دل میں قدر کیا اے درد
آہ۔ ترا لذت آشنا ہوں میں
ایک ناکارہ آرزو بن جائے کون سے درد کی دوا ہوں میں

(۷۹)

مآلِ عشرتِ فانی پہ شرمسار ہوں میں
خود اپنے تیر کا مارا ہوا شکار ہوں میں

سرورِ شب کا نہیں صبح کا خمار ہوں میں
نکل چکی ہے جو گلشن سے وہ بہار ہوں میں

علاقہ اب بھی ہوا کا ہے خاک سے باقی
جو بیٹھنے نہیں پاتا ہے وہ غبار ہوں میں

مٹی ہوئی سی ہوں تصویر اپنی حسرت کی
گیا ہوا ترے وعدے کا اعتبار ہوں میں

قتیلِ ناز کا قاتل ہی خونبہا تو نہ ہو
وہ آ بنی ہے کہ دشمن کا دوستدار ہوں میں

فغاں سے کی ہے۔ یہاں آکے ابتدائے کلام
مآلِ زیست کا پہلے سے سوگوار ہوں میں

جگہ نہ ایسی ملے گی نہ جم کے بیٹھوں گا
بہت رہا جو ترے دل میں وہ غبار ہوں میں

مثالِ قبلہ نما آشیاں سے محوِ چمن
سکوں حصول ہے اور پھر بھی بیقرار ہوں میں

کرم پہ تیرے نظر کی تو ڈھے گیا وہ غرور
بڑا تھا ناز کہ حد کا گناہگار ہوں میں

نئی ادائیں نہ دیں دعوتِ طرب پیہم
ابھی تو مردہ امیدوں کا سوگوار ہوں میں

جفا اُٹھانے میں دکھ ہے تو آپ سے کیا کام
وفا گنہ ہے تو اپنا گناہگار ہوں میں

دکھا کے ساغرِ خالی جما ہی کہتی ہے
جو گزرے کیف میں اس رات کا خمار ہوں میں

نہ پوچھ اپنے سوا مجھ سے اور کی حالت
کہ مثلِ آئینہ ہر اک کا رازدار ہوں میں

فنا ہے عینِ بقا آرزو محبّت میں
خزاں بہار نہ جانو سدا بہار ہوں میں

(۸۰)

کل قہقہہ مینا کا تھا اب چشمِ ترِ ساغر ہوں میں
بدلی ہے شانِ زندگی افسانۂ دیگر ہوں میں

تم شکوے سن سکتے نہیں اور گُٹ کے چپ کیونکر ہوں میں
فیصل ہے یہ جھگڑا ابھی کہہ دو کہ غارت گر ہوں میں

جان اِک امانت جسکی تھی پھر آج اسی کو سونپ دی
قاتل سے اپنے سرخرو خونِ لبِ خنجر ہوں میں
اک چپ کے معنی سیکڑوں اک غم پہ لاکھوں تہمتیں
اتنا ہی رسوائے جہاں جتنا حیا پرور ہوں میں
مشقِ ستم سے پوچھ لے۔ ترکِ ستم سے پوچھ لے
پتھر سے بڑھ کر سخت ہوں شیشے سے نازک تر ہوں میں
جب سوزِ غم افزوں ہوا۔ شعلہ سا لہرانے لگا
چپ رہ کے بھی سب کہہ گیا کتنا زباں آور ہوں میں
سو ظلم ڈھا کر دیکھ لے۔ اور آزما کر دیکھ لے
چوٹوں سے نرمی آ چکی، انساں نہیں پتھر ہوں میں
ہے بے قراری زندگی اور مرگ دم بھر کا سکوں
اس دشتِ پر آشوب میں اک موجۂ صرصر ہوں میں
سیلابِ بحرِ شوق کی ہر موج ہے موج آفریں
مٹنا مرا دشوار ہے یک روح صد پیکر ہوں میں
کم کر کے گرمی شوق کی پہنچا نہ منزل کی طرف
پگھلا ہوا اولا ہے دل پانی نہیں پتھر ہوں میں

جب آرزو کچھ پڑھ دیا محفل کو وجد آنے لگا
اس دورِ بے کیفی میں بھی اک گردشِ ساغر ہوئی میں

(۸۱)

جلتا ہوا پروانے کا دل ایک ہے سو میں
امید کی تصویر ہے بڑھتی ہوئی لَو میں
راز اب بھی رہے راز تو بہرا ہے زمانہ
کیا جانئے کیا کیا نہیں بک جاتا ہوں رَو میں
خاصیتِ آئینہ ہے ہر جزو میں دل کے
سَو ٹکڑے کرو پھر بھی وہی ایک ہے سو میں
چھپکاتی ہے جب آنکھ ترے حُسن کی بجلی
قسمت کی سیاہی نظر آجاتی ہے ضو میں
جو حد سے گزر جانے پہ لے جائے سَرِ دار
پیچھے ہی رہو آرزو ایسی تگ و دَو میں

(۸۲)

خنجرِ ناز اُدھر زخم اِدھر سینے میں
جذب ہیں حُسن کے جوہر اسی آئینے میں
غم میں ہے لطف وہیں تک کہ ہو اُمیدِ خوشی
ورنہ لذّت نہیں کچھ خونِ جگر پینے میں
بے کماں چلتے ہیں جو ہیں وہ فقط حُسن کے تیر
آنکھ میں نوک ہے مژگاں کی کھٹک سینے میں
مقتلِ ناز سے لو زیورِ آرائشِ حُسن
سب طرح کے ہیں جواہر اسی گنجینے میں
آشنا لذّتِ غم سے جو نہ ہو کیا جانے
کہ مزے آتے ہیں کیا خونِ جگر پینے میں
رشتۂ خامِ نفس دے نہ سکا ساتھ افسوس
ٹانکے ٹوٹا ہی کیے چاکِ جگر سینے میں
آرزوؔ بعد امیری نہ غریبی آئے
ملتا ہے ٹاٹ کا پیوند بھی پشمینے میں

(۸۳)

بات دل کی ایک ہی ہے تم کہو یا ہم کہیں
تیسرا ہے کون جس کو راز کا محرم کہیں

(۸۴)

یہ جو دو اک بہار کے دن ہیں
زندگی میں شمار کے دن ہیں
فرق لذّت کا ہے اگر احساس
تو خزاں بھی بہار کے دن ہیں
ظلم ہے عمر میں شمار اُن کا
ایسے کچھ انتظار کے دن ہیں
جوشِ گل میں بھی خار کی ہے خلش
اک مصیبت بہار کے دن ہیں
ہے جو عہد شباب دعوتِ کیف
عیشِ ناپائدار کے دن ہیں
ہے معین نفس کی آمد و شد
عمر گنتی شمار کے دن ہیں

مدتِ وعدہ دور ہے اے دل
تھم کہ صبر و قرار کے دن ہیں

بیم و امید کے سیاہ و سپید
گردش روزگار کے دن ہیں

آرزو ملتفت ہے کوئی حسیں
شکوے چھوڑو کہ پیار کے دن ہیں

(۸۵)

کچھ اس سے بڑھ کے پاتے ہیں تجھے جتنا سمجھتے ہیں
ہم اس اُٹھتے ہوئے پردے کو بھی دھوکا سمجھتے ہیں

خدا جانے حقیقت میں ہے کیا اور کیا سمجھتے ہیں
وہ ہنس دیتا ہے جس کو لوگ دیوانا سمجھتے ہیں

دلِ بے تاب اضمحلال ناکامی کو ہم تیرے
[illegible] پھیر اک کی حسرت کا نظارا سمجھتے ہیں

پلٹ جاتی ہیں کیفِ بے خودی میں پتلیاں جن کی
ہم اُن آنکھوں کو بھی اُلٹا ہوا پردا سمجھتے ہیں

[illegible] بندی ہے شکوؤں کی ستم ڈھا ڈھا کے یہ کہنا
[illegible] پر ناز ہوتا ہے جسے اپنا سمجھتے ہیں

فریب جلوۂ نیرنگ ہے جن کی نگاہوں میں
وہ ہر پردے کے آگے تجھ کو بے پردا سمجھتے ہیں
یہی دل عشق کا مرکز یہی دل حُسن کا مرجع
ہم اس امید گہ کو حاصلِ دنیا سمجھتے ہیں
بڑے اے آرزوؔ بھولے ہیں یہ قاتل ادا والے
وہ کب کا مر چکا اب تک جسے زندا سمجھتے ہیں

(۸۶)

ہم دل کی گرہ کھول کے اُلجھن میں پڑے ہیں
پھانسی ہیں وہ دو ہاتھ کہ گردن میں پڑے ہیں
تھے قبل اسیریِ قفس بازوؤں کا زور
ٹوٹے ہوئے کچھ پر کہ نشیمن میں پڑے ہیں
بے سمجھے جو کر بیٹھے تھے دیدار کا دعوے
گُم ہوش کئے وادیِ ایمن میں پڑے ہیں
ہر سال خدا رکھے ترقی ہے جنوں کی
مِنّت کے ہیں یہ طوق کہ گردن میں پڑے ہیں
دُھونے سے مٹیں داغ مگر یہ نہ مٹیں گے
چھینٹے جو نچوڑے ہوئے دامن میں پڑے ہیں

اُن کو تو ہر اک بات پہ ہنس دینے کی عادت
کیا نکلا زباں سے ہم اِس اُلجھن میں پڑے ہیں
تم ایسے پشیمانِ وفا آرزوؔ اکثر
منھ اپنے لپیٹے ہوئے مدفن میں پڑے ہیں

(۸۷)

ہم کو تو حسرت دیں کبھی عزت ان کو ضد کہ خفیف کرو
ڈھائیں ستم اور اس پہ ستم یہ کہتے ہیں تعریف کرو
خود غرضی کا ہے یہی مذہب اپنے قدح کی خیر مناؤ
پاؤ اگر قسمت کا لکھا تو اسمیں بھی تحریف کرو
دیتی تھی جو دوئی کا دھوکا اور تھی کس کی پرچھائیں
ان کا ٹھٹھکنا میری یہ منت اور ذرا تکلیف کرو
صنفِ سخن کی بلندی پستی فکرِ سخن کے تابع ہے
جس سے دماغ و دل کی جلا ہو ایسا کچھ تصنیف کرو
ضد میں جفا کی شاخِ شجر ہے آرزوؔ اپنی شاخِ وفا
ایک کے دو ہوں دو کے گیارہ کاٹ کے گر تنصیف کرو

(۸۸)

اہل دل کا ہے وظیفہ داستانِ آرزو
ہوک سچے درد کی سمجھو فغانِ آرزو
کیا سمائے اُس کے کانوں میں صدائے ناشناس
آرزو اپنے لئے خود ہے جہانِ آرزو
نکلو اپنی تنگ دنیا سے تو پھر آنکھیں کھلیں
ہیں الگ اُس سے زمین و آسمانِ آرزو
جوہر فولا ہے وہ صیقل آئینہ ہے
اور ابھرے گا مٹانے سے نشانِ آرزو
رنگ و بو پہچاننے والے بتا دیتے ہیں صاف
ان گلوں میں ہے بہارِ بوستانِ آرزو
آ گیا جو کچھ زباں پر آج عادت کے خلاف
زخم دل کا بہتا خوں ہے یہ بیانِ آرزو
آرزو کو خوش نصیبی نے کیا محسود خلق
رو رہیں اپنی قسمتوں کو حاسدانِ آرزو

(۸۹)

بھلاوے دے رہا ہے شوق حسرت آفریں مجھ کو
وہاں باتیں ہی باتیں اور یہاں سب کچھ یقیں مجھکو
فریب وعدہ اُس کا اور آجانا یقیں مجھ کو
سہارا پا کے امیدیں مصیبت بن گئیں مجھ کو
ادب آموزِ راہِ شوق ہیں تیری گزرگاہیں
جہاں نقشِ قدم پانا وہیں گھسنا جبیں مجھ کو
بس اب ناکامیوں ہی پر مدار کامیابی ہے
کہ خوش ہوتا ہے کوئی۔ دیکھ کر اندوہ گیں مجھکو
جو نکلیں جان بن کر اور رہیں دل میں خلش ہوکر
یہ قسمت ہے کہ ایسی ہی تمنائیں ملیں مجھکو
سراپا شوق ہونے پر خموشی کے ہیں یہ معنی
کہ کہنا تھا بہت کچھ تم سے وقت واپسیں مجھکو
یگانے سب سے بڑھ کر باعثِ آزار ہوتے ہیں
سمجھ کر خاک کا پتلا مٹاتی ہے زمیں مجھکو
وہاں وعدے کے سچ ہونے نہ ہونے پر نظر کسکی
قسم سے تو غرض یہ تھی کہ آجائے یقیں مجھ کو

وفا سیکھی تو سیکھا زہر کو امرت بنا لینا
جو تڑپاتی تھیں وہ ٹیسیں مزا دینے لگیں مجھکو
مرے خوں میں کفن میں اب ہے اتنا پارچہ شامل
لہو جس میں بھرا ہے دیتا جا یہ آتشیں مجھ کو
یہی گنتی کی سانسیں اور ضروری سیکڑوں باتیں
کہوں کچھ اور مہلت آرزو اتنی نہیں مجھ کو

(۹۰)

ہو چکی نفرت دوا سے عشق کے بیمار کو
اب تھمیں روکو گے اس گرتی ہوئی دیوار کو
کاہشِ جاں دور کر دی کھو کے ہر آزار کو
موت نے جینے کے قابل کر دیا بیمار کو
کرتی ہیں کارِ زباں کیونکر نگاہیں شوق کی
دیکھنا تھا یہ تماشا طالبِ دیدار کو
دردِ جاں پرور پر اپنے اسکی حسرت دیکھئے
ہو نہ باقی موت کی بھی آس جس بیمار کو
رحم کی خو گر ہو لاکھ اس کی نگاہِ التفات
کاہشِ غم خود سکھائے گی کھٹکنا خار کو

بن چکی عادت طبیعت تو بہ ٹوٹے یار ہے
جام سے منھ پھیرنا آتا نہیں مے خوار کو

بے رخی جنکی ہے قاتل. زہر جن کا التفات
دیکھئے وہ کام میں لاتے ہیں کس تلوار کو

اے زلیخا بعد یوسف رہ گیا کیا یہ بتا
کی خریداری کہ لوٹا مصر کے بازار کو

حُسن خود قاتل ہے اسیر ہو نہیں چلتا سنگار
دو گے اب صیقل کہاں تک اس اُپنی تلوار کو

یاس سے امید میں سختی سوا تھی آرزو
خود بدلوانا پڑا انکار سے اقرار کو

(۹۱)

کون دیوانہ کہے عشق کے دیوانے کو
گرتے دیکھا نہ بجھی شمع پہ پروانے کو

فوق ظلمات پہ ہے میرے سیہ خانے کو
شمع ہے اور نظر آتی نہیں پروانے کو

میری آزاد خیالی سے ہوا تنگ جہاں
روز ڈھونڈا کیا دل اک نئے ویرانے کو

دل نہ ترسے ہوئے میکش کا بھرے گا جبتک
ہونٹ چپکے ہوئے چھوڑیں گے نہ پیمانے کو

چاک دامانِ یوسف کو ہنسی میں نہ اڑا
کہیں دُہرا دے نہ کوئی اسی افسانے کو

دیکھئے کب تنِ خاکی سے رہا ہوتی ہے روح
اک بگولے نے بُرا پھانسا ہے دیوانے کو

بعد ہر سانس کے بڑھتی ہے عدم کی سرحد
اپنی بستی سے الگ رکھ مرے ویرانے کو

آئے کہنے پہ تو ڈر کا ہے کا اے الکن حور
تم نے بے ربط کیا عشق کے افسانے کو

آرزو پھیر لی ساقی نے جو بے وجہ نگاہ
تو بھی پیماں کی طرح توڑ دے پیمانے کو

(۹۲)

جفا پسند رہو صاحبِ وفا نہ بنو
یہی ہے جب تو کسی دل کا آسرا نہ بنو

نہ یہ کہو تری تقدیر کا ہوں میں مالک
بنو جو چاہو خدا کے لئے خدا نہ بنو

فقط ہے قاتل و مقتول کے لئے یہ مقام
بنا سکو نہ نشانہ تو خود نشانہ بنو
اگر ہے جرم محبّت تو خیر یوں ہی سہی
مگر تمہیں کہیں اِس جرم کی سزا نہ بنو
جب ایک ہیں تمھیں دو نو تو ہم یہ کہتے ہیں
دوائے درد بنو دردِ لا دوا نہ بنو
فنا بقا ہے حقیقت میں اور بقا ہے فنا
جو بھول ہی نہیں سکتا ہے وہ فسانہ بنو
ملے بھی کچھ تو ہے بہتر طلب سے استغنا
بنو تو شاہ بنو آرزو! گدا نہ بنو

(۹۴)

دے کے فریب لے کے دل کہتے ہیں حیلہ ساز ہو
اُلٹے بنا ہوں لٹ کے چور۔ دستِ ستم دراز ہو
ہر سرِ نقش پائے ناز۔ سجدہ گہِ نیاز ہو
سنّتِ عشق ہو ادا۔ چاہے قضا نماز ہو
دیر و حرم ہوے تو کیا۔ ہیں یہ مکان بے مکیں
سر تو وہاں جھکے گا جو۔ تیرا حریم ناز ہو

روز نئے ہیں امتحاں ۔ روز نئی ہیں سختیاں
جیسے ہیں سب ہوس پرست ۔ اک تمھیں پاک باز ہو

ہم سے نہ ہو سکے گا یہ ۔ رکھیں جو دل کو مار کے
خونِ غریب بے قصور ۔ اس کے تمھیں مجاز ہو

جیسے صدائے بے پیام ۔ ویسے پیام بے صدا
ساز وہ جس میں سوز ہو ۔ سوز وہ جس میں ساز ہو

پوچھنے ہی پہ گر ہے ضد ۔ کہتا ہوں میں بھی صاف صاف
ہاں اسی راز کی قسم ۔ ہاں تمھیں دل کے راز ہو

اپنا درِ امید بھی ۔ ہے درِ فتنہ کا جواب
باز کرو تو بند ہو ۔ بند کرو تو باز ہو

بعد غروب آفتاب ۔ وقتِ طلوع ماہ ہے
حد بھی جفا کی ہے ضرور ۔ عمر وفا دراز ہو

بات وہ ایک ہی سہی ۔ شان محل تو ہے جدا
لب پہ ہو آکے شرحِ حال دل میں رہے تو راز ہو

گھر ہو کہ بن ہر ایک جا ۔ دھیان ہے اس کا دم کے ساتھ
دور بھی رہ کے بچ چکے ۔ دستِ ستم دراز ہو

پہلے جگر پہ چوٹ کھائیے۔ پھر کہیں حال دل سنائیے
شرطِ کرم کے ہیں نثار۔ حد کے ستم نواز ہو
گاہ قیام گہ قعود۔ گاہ رکوع گہ سجود
راہِ طلب میں ہر قدم۔ شکر کی اِک نماز ہو
دل نہ ہوا غریب کا۔ کوئی کھلونا ہو گیا
روگ لگاؤ آپ ہی۔ آپ ہی چارہ ساز ہو
چپ تھا بہت دنوں سے جو۔ آج یہ کہہ کے مر گیا
منھ میں نہ اُس کے ہو زباں۔ سینے میں جسکے راز ہو
کیوں وہ رہے جو آرزو حد میں نہ اپنی رہ سکے
کاٹ دے غیرتِ طلب۔ ہاتھ اگر دراز ہو

(۹۴)

دل کے قمار خانے میں۔ دونوں کی آن بان ہو
جیتے ہوؤں کا حوصلہ۔ ہارے ہوؤں کی جان ہو
ہاں وہ بنے پیامبر۔ جس میں وفا کی شان ہو
دل میں ہو میرے دل کا درد۔ منھ میں مری زبان ہو
یہ نہ سہی وہی سہی۔ دونوں کا حاصل ایک ہے
عشق کا تذکرہ نہ ہو۔ حسن ہی کا بیان ہو

آیا ہوں کوئے دوست میں ڈالنے قبر کی حد میں
کھینچوں زمیں پہ یوں لکیر۔ دل پہ بھی اک نشان ہو
طالب رحم جاکے ہوں۔ شوق سے غمگسار ہجر
یوں نہ مگر کہ سُنتے ہی۔ اُن کو مرا گمان ہو
ذکرِ جفا بُرا نہیں۔ گر ہو بطرز جوشِ شوق
اے لبِ شکوہ مند دیکھ۔ کم نہ وفا کی شان ہو
زخم ہی زخم دل میں ہیں۔ کاہے کے ہیں پتا نہیں
تیر ہیں جس کے بے پناہ۔ تم وہ کڑی کمان ہو
ہو تمھیں لطفِ زندگی کچھ نہیں گر تمھیں نہیں
جان ہے تو جہان ہے۔ جان نہیں تم جہان ہو
شاک ہی رہا وفا میں جب۔ حق وفا کہاں رہا
جان نثار بات پر۔ ہو ابھی امتحان ہو
عرض نیاز آرزو الکنِ طور ہی سے سیکھ
دل ہمہ تن زبانِ شوق۔ اُسپہ نہ کچھ بیان ہو

(۹۵)

ضبط سے ہے غرض اتنی کہ عیاں راز نہ ہو
رہے نالوں کا وہ انداز کہ آواز نہ ہو

آہ بیکار ہے گر سوز اثر ساز نہ ہو
تار وہ توڑ دو جس تار میں آواز نہ ہو

تیر سرگردِ نظر دل پہ نہ بسمل کے جما
رعشہ ہاتھوں میں کہیں او قدر انداز نہ ہو

اس نے موقع نہ دیا شکر کا بھی اس ڈر سے
کہ وہی شکوۂ دیرینہ پھر آغاز نہ ہو

رند پیماں شکن ایسا ہوں کہ جا کر سرِ عرش
سر بھی ٹکرائے مری توبہ تو در باز نہ ہو

کچھ مروت ہے جو آنکھوں میں تو سن لے نہ ذرا
ہو نگاہ ایک ہی لیکن غلط انداز نہ ہو

ہاتھ کو روک کے پیر کا وہ دیا ہے کہ پناہ
اپنا قاتل کہیں خود عاشقِ جاں باز نہ ہو

پھڑک اے مرغِ قفس شوق ہے لیکن اتنا
تیلی ٹوٹے تو شکستہ پرِ پرواز نہ ہو

یوں چھپاتا ہوں میں رہ رہ کے کسی کی تصویر
تاڑ لے دیکھ کے وہ بھی جو نظر باز نہ ہو

قید مضبوط نہیں دام قفس کی صیاد
رکھ وہ برتاؤ کہ دل مائلِ پرواز نہ ہو
آرزو داد سخن دیں گے سخن سنج مجھے
کیا کرے قدر جواہر جو نظر باز نہ ہو

(۹۶)

روز تغیّرات رُخ۔ غور سے دیکھ یا نہ دیکھ
دیکھنا ہو جو اپنا حال۔ آئینۂ زمانہ دیکھ
شوق کی انتہا کو سوچ۔ کام کی ابتدا نہ دیکھ
سانس کا اعتبار کیا۔ بہتی ہوئی ہوا نہ دیکھ
رُک کے لیا جو دم تو پھر۔ خام ہے شوق جستجو
جس کی مدد کا ہو یقیں۔ اس کا بھی آسرا نہ دیکھ
پردے کے اس طرف ہوں میں۔ پردے کے اس طرف ہے دل
میں تجھے دیکھ جاؤں گا۔ تو مجھے دیکھ یا نہ دیکھ
دکھ میں ہے سکھ تو سکھ میں دکھ نعمتِ رب ہے جو ملے
آ نہ فریب نفس میں۔ دیکھ بھلا بُرا نہ دیکھ
برسے ہیں ابر بن کے جو سب ہیں یہ دل کے ابخرے
پانی کے بدلے آگ ہے۔ آنسوؤں کا خزانہ دیکھ

شق نہ ہو جذبِ غم کے بعد دل وہ کہاں سے لائیگا
کان سے واقعات سُن۔ آنکھ سے ماجرا نہ دیکھ
عیب بنے دلیلِ عیب، یہ کوئی قاعدہ نہیں
اپنے کو داغ سے بچا، دامنِ یار سا نہ دیکھ
علم بھی ہو تو لے نہ کام۔ بگڑے گا دہر کا نظام
ناصیہ کے خطوط میں حالِ دل اور کا نہ دیکھ
جتنا دہاں بہا تھا خوں، جذب اس آئنے میں ہے
اپنے ہی دل پہ کر نظر، مقتلِ کربلا نہ دیکھ
شوق سے وقتِ جستجو، طالبِ جذب بھی ہے تو
بے غرضی پہ آرزوؔ مسلک شاطرانہ دیکھ

(۹۷)

کم ظرف نہیں ہوں میں۔ اے ساقی میخانہ
خم جس میں سما جائیں۔ ہے دل کا وہ پیمانہ
اتنا تو محبت میں۔ اپنے سے ہو بیگانہ
کل شمع نظر آئے۔ جو آج ہے پروانہ
ہر دانہ پہ اک قطرہ، ہر قطرہ پر اک دانہ
اس ہاتھ میں ثمرن ہے اُس ہاتھ میں پیمانہ

کچھ تنگیِ زنداں سے دل تنگ نہیں وحشی
پھرتا ہے نگاہوں میں۔ ویرانہ ہی ویرانہ

بے صبر گرا جس پر۔ وہ شعلہ خود اُس میں تھا
سمجھا نہ لگی دل کی۔ پروانہ تو پروانہ

گرتا نہ سرِ منزل۔ تو حد سے گزر جاتا
کیا خوب سنبھالا ہے۔ اے لغزشِ مستانہ

دل تنگ نہیں کثرت۔ گر وسعتِ وحدت سے
کعبے ہی میں کیوں آخر۔ تعمیرِ صنم خانہ

الفت بھی عجب شے ہے جو درد وہی درماں
پانی پہ نہیں گرتا۔ جلتا ہوا پروانہ

سنتے رہے وہ پہلے۔ پھر چونک کے منہ دیکھا
خوب آج بنا کہتے۔ بے نام کا افسانہ

وہ آرزوِ میکش درویش در ساقی
پی جاتا ہے آنکھوں میں رکھتا نہیں پیمانہ

کل آرزو اک در پر سر پھوڑ کے روتا تھا
میں نے جو کہا یہ کیا۔ ہنسنے لگا دیوانہ

(۹۸)

فصلِ گل باغ میں دلکش نہیں صیاد ابھی
پر ہیں بے زور نہ کر قید سے آزاد ابھی

گرتا پڑتا یونہیں پہنچوں گا سرِ منزلِ عشق
جھجک اُس سے ہی کہ ہے پہلی ہی افتاد ابھی

بھرنے بیٹھے جو تلوّن تری تصویر میں رنگ
کانپ کر رکھ دے قلم ہاتھ سے بہزاد ابھی

غلط انداز نظر پر ہے طلسمِ اُمّید
بے اثر شوق کی کمزور ہے بنیاد ابھی

یہ بھی صورت گریِ شوق شہادت تو نہ ہو
کھینچے تلوار یہیں تھا کوئی جلاد ابھی

دلِ مایوس پہ پھر اک نگہِ شوق افزا
یہی ویران مکاں ہوتا ہے آباد ابھی

مرنے والوں سے طلب کرتے ہو دعوے کا ثبوت
جان پر کھیل نہ جائے کوئی ناشاد ابھی

آرزوؔ کون ہے کہہ دو مرا دیوانہ ہے
اک گرفتار ہوا جاتا ہے آزاد ابھی

ہے فن شعر میں تکمیل کی منزل ناپید
آرزوؔ آپ بھی ہیں نام کے اُستاد ابھی

(۹۹)

اوّلِ شب وہ بزم کی رونق۔ شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے۔ ختم تھا یہ افسانہ بھی

قید کو توڑ کے نکلا جب میں اُٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے
دشتِ عدم تک جنگل جنگل۔ بھاگ چلا ویرانہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا۔ موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل۔ ڈوب چلا میخانہ بھی

خون ہی کی شرکت وہ نہ کیوں ہو۔ شرکت چیز ہے جھگڑے کی
اپنوں سے وہ دیکھ رہا ہوں۔ جو نہ کرے بیگانہ بھی

ایک لگی کے دو ہیں اثر۔ اور دونوں حسب مراتب ہیں
لَو جو لگائے شمع کھڑی ہے۔ رقص میں ہے پروانہ بھی

دونوں جولاں گاہ جنوں ہیں۔ بستی کیا ویرانہ کیا
اُٹھ کے چلا جب کوئی بگولا۔ دوڑ پڑا دیوانہ بھی

وحدت میں کی کثرت پیدا۔ جلوؤں کی یا شانی نے
ایک ہی جا تھا کچھ دن پہلے۔ کعبہ بھی، بتخانہ بھی

غنچے جیب ہیں گل ہیں ہوا پر۔ کس سے کہئے جی کا حال
خاک نشیں اک سبزہ ہے۔ سو اپنا بھی بیگانہ بھی

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا۔ اڑکے چلا پروانہ بھی

دورِ مسرت آرزو اپنا۔ کیسا نہ لزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

(۱۰۰)

نگاہ لڑتے ہی چتون کڑی نہیں رہتی
بڑوں کی بات بھی اس جا بڑی نہیں رہتی

بگولے اُٹھ کے یہ کہتے ہیں خاک بے کس کے
کسی غریب کی میّت پڑی نہیں رہتی

دکھائے اپنی بھی گرمی شباب دو دن کا
کڑی یہ دھوپ ہمیشہ کڑی نہیں رہتی

جو وہ نہ آئے تو مشکل قضا نے کی آساں
یہ سچ کہا ہے کسی کی اڑی نہیں رہتی

رُکے نہ آرزو اُس میں جو کام کرنا ہو
کہ آگئی تو اجل پھر کھڑی نہیں رہتی

(۱۰۱)

بگاڑ پر بھی تو ہے اُن سے حسنِ ظن باقی
سخن تمام ہے اور حاصلِ سخن باقی

نہ بھول حالتِ حق گو نہ توڑ مہرِ سکوت
زبانِ دار پہ ہے قصۂ رسن باقی

خزاں نچوڑ چکی ہے بہار کا دامن
سوائے رنگ نہیں بوئے یاسمن باقی

یہ دشتِ حرص ہے غارتگروں کا مسکن ہے
پھٹا بھی ہے تو رہے گا نہ پیرہن باقی

وفا وفا ہے تو پھر نقش مٹ نہیں سکتا
اگر ہے کوہ تو ہے نامِ کوہکن باقی

جنوں معاف ہو مجبوریوں پہ کر کے نگاہ
کہ بس میں ہاتھ نہ تھے رہ گیا کفن باقی

پھر اک نگاہِ کرم ساقیِ الست کی خیر
کہ اب نہیں اثرِ بادۂ کہن باقی

اُٹھے نہ پردہ مگر چھیڑ چھاڑ ہوتی رہے
کہ ذوقِ عشق ہو جب تک ہے یہ انجمن باقی

تو اس کا ہو کہ نہ ہو وہ تو ہو چکا تیرا
اب آرزو میں کہاں خوئے دشمن باقی

(۱۰۲)

ہے قوی کتنی شہادت کشتۂ بیداد کی
پتلیاں آنکھوں میں تصویریں ہیں جلاد کی

دل کی وحشت نے نشیمن کی بنا برباد کی
چھٹ پڑا تنکا نظر جب پڑ گئی صیاد کی

تھی گراں زنجیرِ آہن بھی جنوں بھی زور پر
جو کڑی ٹوٹی صدا نکلی مبارک باد کی

شور پر کی ہمصفیروں نے جو گھبرا کر نگاہ
آشیاں خالی تھا مٹھی بند تھی صیاد کی

قم باذنی کہہ کے حکم واپسی کس نے دیا
تہلکے میں آ گئی بستی عدم آباد کی

زندگی کو دی ترقی آرزوئے مرگ نے
رحم کی خواہش پہ سختی بڑھ گئی صیاد کی

قید کی سختی اٹھے گی کس سے آزادی کے بعد
قبر رہ سکتی نہیں مجھ خانماں برباد کی

آرزو آئینہ اصلاح رکھ دو سامنے
شکل منکر کو نظر آجائے گی استاد کی

(۱۰۳)

مل گیا سب کچھ کہ قیمت اس نے پوچھی جان کی
جان اب دے دوں گا لے کر سانس اطمینان کی
جل گیا دل یا نہیں تم کو ہے کیوں اس کی کرید
بس ہٹو چنگاریاں بکھریں گی آتشدان کی
کہتے ہیں وہ خوں بہا مقتول کا میں آپ ہوں
اللہ اللہ اس قدر قیمت ذرا سی جان کی
حُسن سیرت پر نظر کر حُسن صورت کو نہ دیکھ
آدمی ہے نام کا گر خو نہیں انسان کی
دھیان آتا ہے کہ ٹوٹا تھا غلط فہمی میں عہد
یادگار اک ہے تو دھندلی سی مگر کس شان کی
عشق میں رکھا ہی کیا ہے جلنے مرنے کے سوا
آرزو بھاگو ہوا ہے گرم اس میدان کی

(۱۰۴)

حُسن سے شرح ہوئی عشق کے افسانے کی
شمع لَو دے کے زباں بن گئی پروانے کی

شان بستی سے نہیں کم مرے ویرانے کی
روح ہر بونڈلے میں ہے کسی دیوانے کی

ایک اک ذرّہ ملا مدفنِ صد آبادی
خاک بیزی جو کبھی کی کسی ویرانے کی

آہ نے شرحِ غم دل سے سبک بار کیا
متن دو حرف میں لکھ کر مرے افسانے کی

آمدِ موسمِ گل کی ہے خبر دورِ دگر
تازگی چاہیئے کچھ ساخت میں پیمانے کی

ایک جلوے کے ہیں اے برہمن اتنے جلوے
شمع گل کر کے ذرا دیکھ صنم خانے کی

کِھلتی کلیوں کی چٹک مژدۂ آزادی ہے
قید توڑیں گے یہ جھٹکے کسی دیوانے کی

آئی ہے کاٹ کے میعادِ اسیری کی بہار
ہتکڑی کھل کے گری جاتی ہے دیوانے کی

سرد اے شمع نہ ہو گرمیٔ بازارِ جمال
پھونک دے روح نئی لاش میں پروانے کی

اُٹھ کھڑا ہو تو بگولا ہے، جو بیٹھے تو غبار
خاک ہو کر بھی وہی شان ہے دیوانے کی

آرزو ختم حقیقت پہ ہوا دورِ مجاز
ڈالی کعبے کی بنا آ کے بت خانے کی

(۱۰۵)

انکار کی جا انکار نہیں اقرار کی جا انکار سہی
خوں ریز ہیں دونوں ہی حربے۔ برچھی نہ سہی تلوار سہی

مانا کہ انھیں دل لینا تھا۔ ہم دیتے ہی جو کچھ دینا تھا
مشتاق نظر مے نوش سہی متوالی نظر ہشیار سہی

یک رنگیٔ ذوق مقدم ہے۔ نیرنگیٔ شوق کو جانے دو
جب رشتہ قائم کرتا ہے۔ سبحہ نہ سہی زنار سہی

غفلت سے کہیں بہتر تھی جفا۔ یعنی کہ محبت تھی زندہ
جو ایذا تھی سہہ لینے کی۔ اک بار نہیں سو بار سہی

کیوں شوق طلب سے باز رہیں انجام محبت کیوں سوچیں
اک دل کا بہلاوا تو ہے سب دردسری بے کار سہی

ہے قبر ہمیں گھر کا کونا۔ وہ ہو بھی چکا جو تھا ہونا
کیوں روتے پھریں دل کا رونا۔ ہم اپنے ہی ماتم دار سہی
بے چینی آرزو و الفت کی۔ راحت کی ضمانت دار بنی
ہے دارو صد آزار یہی۔ خود روگ سہی آزار سہی

(۱۰۶)

دوری منزل کا ہر منزل پہ دھوکا ہی سہی
ہم نے تو آغوش راحت میں بھی ایذا ہی سہی
زہر ہے غم کی دوا دینا ہے دل والے کا کام
کوئی بیگانہ نہیں آئنا تو اپنا ہی سہی
حسرت دید اس ادائے شرم پر کردوں نثار
آپڑی ہے ضد جو پردے کی تو پردا ہی سہی
ہائے یہ غربت یہ تنہائی کی ہیبت الاماں
ہو سہارا تو کسی کا غول صحرا ہی سہی
جس سے وابستہ ہے دل ہاتھ اُسکے دامن سے ہے دور
نام کیوں قسمت کا لیں ہم اپنی کوتاہی سہی
بن نہیں سکتا ہے امن عالم کون و فساد
ایک قاتل وہ بھی ہے دل کی تمنا ہی سہی

کچھ سہارا چاہتی ہے عاشقی کی زندگی
بے نیازی تیرے صدقے نازِ بے جا ہی سہی
وجہِ تسکیں بن گئی اے آرزو افراطِ غم
خوگرِ ایذا نے ایذا جس قدر چاہی سہی

(۱۰۷)

جفا سے پہلے ہمیں خوگر جفا کرتے
گلہ گلہ ہی نہ رہتا تو کیوں گلا کرتے
نہ ترکِ شوق نہ اظہارِ مدعا کرتے
تمھیں کہو نہ یہ کرتے نہ وہ تو کیا کرتے
نیاز و ناز کا قصّہ قضا نے پاک کیا
نہیں تو پھر یہ تماشے یونہیں ہوا کرتے
کلیم جو ہو وہ الکن تو ہو نہیں سکتا
یہ کہیے بن نہ پڑی عرض مدعا کرتے
صنم کدے سے جدھر بھی نصیب پلٹا دے
یہاں تک آ تو گئے ہیں خدا خدا کرتے
وہی حکایتِ دل تھی وہی شکایتِ دل
تھی ایک بات جہاں سے بھی ابتدا کرتے

یہ کم ہوا بھی بلا کی ہے اشتعال انگیز
دبی زباں سے بھی ڈرتا ہوں التجا کرتے

وہ دل کا بھید کہ گونگا بنا دیا جس نے
یہ تھا فسانہ کہ اک ایک سے کہا کرتے

بکھر گئیں اُنھیں ہاتھوں سے ٹوٹ کر زنجیر
جو تارِ جیب پہ ٹھٹکے تھے ابتدا کرتے

ثبوت جرم پہ بھی حق سزا دہی کا نہیں
وہ مدعی جو نہ بنتے تو فیصلا کرتے

اُلجھ رہا تھا خود اُڑ اُڑ کے ہاتھ سے دامن
درازدستیِ وحشت کا کیوں گلا کرتے

یہ ہے کہ داد رسی پر نہیں ہو تم مجبور
نہ یہ کہ آئی حیا ہم کو التجا کرتے

بنے تھے اس لئے بجلی کہ آنکھ جھپکا دو
بدل کے بھیس بھی رکتے ہو سامنا کرتے

کہے کی شرم اُدھر آرزوؔ ادھر یہ خیال
دیا تھا درد جنھوں نے وہی دوا کرتے

(۱۰۸)

دل توانا دیکھتے اعضا کو لاغر دیکھتے
غم تو جب غم تھا کہ اس کو روح پرور دیکھتے

سیر بسمل پر وہ چپ ہیں اس متانت کے نثار
بات منہ دیکھے کی ہو جاتی جو ہنس کر دیکھتے

حسن میں کتنی کشش ہے جذب کتنا عشق میں
سامنے آنکھوں کے رکھ کر دل کا ساغر دیکھتے

پردہ اُٹھ کر گر گیا ہم پھر بھی ہیں محرومِ دید
آنکھ میں آنسو تھے کیونکر آنکھ بھر کر دیکھتے

خون اُبلا آ گئیں جنبش میں گردن کی رگیں
یا وہ رکھ دیتے گلے پر یا نہ خنجر دیکھتے

ٹل نہ جاتا وعدہ فردا سے ہنگامہ تو پھر
اس زمیں پر آج ہی آثارِ محشر دیکھتے

شبہہ ہوتا ہے کہ پانی ہو گیا دل کا لہو
ضبط کہہ دیتا تو دو آنسو بہا کر دیکھتے

ایسا کتنا خوں بہا تھا کشتگانِ ناز کا
ختم تھا دعویٰ جو سُرخی اُن کے منہ پر دیکھتے

سرمہ جذب حسن کا تھا کشتۂ برقِ جمال
راکھ مل جاتی تو آنکھوں میں لگا کر دیکھتے

پھر پس پردہ تھا پردہ جب کوئی پردہ اٹھا
ٹکٹکی باندھے کہاں تک جانب در دیکھتے

منکرِ وحدت بصیرت جنکی تھی کثرت میں گم
توڑتے آئینہ ٹکڑوں کو اٹھا کر دیکھتے

کام ہمت کا ہے کیا معدوم ہیں جب ساز و برگ
قوت پرواز آ جاتی اگر پر دیکھتے

آرزو ہشیار تھے جو ہوش کھو بیٹھے کلیم
خیر آنکھوں کی نہ تھی گر آنکھ بھر کر دیکھتے

(۱۰۹)

دعویٰ ہے یاد دل کے طلبگار کا مجھے
تھا جیسے کوئی قرض کہ دینا پڑا مجھے

پرسش ادھر مزاج کی بند اسطرف زبان
وہ وقت ہے کہ وہ بھی کہیں بے وفا مجھے

ڈھونڈا جہاں جہاں رہی حیراں نگاہِ شوق
نیرنگیٔ جمال نے دھوکا دیا مجھے

ہچکی تھی نزع کی نہ کیا تھا کسی نے یاد
نکلی تھی روح قید سے دے کر دعا مجھے

بڑھتا قدم ہے منزلِ ہستی میں یہ پہلی سانس
بہلا کے لے چلی ہے کدھر یہ ہوا مجھے

خوں ریز ہر ادا ہے پئے امتحانِ عشق
بھولا نہیں ہے معرکۂ کربلا مجھے

کس گل کی بو ہے دامنِ دل میں بسی ہوئی
چلتی ہے چھیڑتی ہوئی بادِ صبا مجھے

تکلیفِ انتظار عدوئے شکیب ہے
گھبرا نہ دے یہ وعدۂ صبر آزما مجھے

گم ہوں تو خود بھی ہوں میں اسی جا جہاں وہ ہیں
اپنا بھی مل رہا ہے انھیں سے پتا مجھے

کیا دردِ دل ہے معنیٔ بے لفظ آرزو
چپ کس لئے ہے بہر خدا کچھ بتا مجھے

(۱۱۰)

بلائے ہوش نہ بن اے نوید یار مجھے
ٹھہر کہ خود ابھی اپنا ہے انتظار مجھے

شمیم گل کی طرح کرکے قید سے آزاد
خبر نہیں کہ کہاں لے گئی بہار مجھے
یہ باز پرس عمل کیوں سزا جزا کیسی
کرو نہ جبر جو بخشا ہے اختیار مجھے
ہوا ہے شوق جفا میں جفا کا نام انصاف
سزا ملی ہے بنا کر گناہ گار مجھے
نیاز و ناز کی ہے پردہ دار یہ تاکید
سنے نہ اور کوئی اس طرح پکار مجھے
جنونِ عشق کا ہر واقعہ ہے ہوش ربا
حواس گم نہ کرو کرکے ہوشیار مجھے
ہے میرے پیکر خاکی کا زور گرمیٔ عشق
کہاں ہے حسن کے لائے بروئے کار مجھے
سبب بغیر تھا ہر جبر قابل الزام
بہانہ ڈھونڈ لیا دے کے اختیار مجھے
کیا ہے آگ لگانے کو بند دروازہ
کہ ہونٹ سی کے بنایا ہے راز دار مجھے
میں آرزو ہی رہوں گرچہ نامراد رہوں
پکار اگر تو اسی نام سے پکار مجھے

(۱۱۱)

اِک خواب تھا شباب تغافل اثر مجھے
کھلتے ہی آنکھ کچھ بھی نہ آیا نظر مجھے

پابندیٔ رسوم کہاں شوق دل کہاں
کس کشمکش میں ڈال دیا ہے مگر مجھے

اک زخم کے علاج میں سو زخم کھائے کون
رہنے دے میرے حال پہ او بخیہ گر مجھے

بادہ اُبل کے ظرف سے بےکیف ہو نہ جائے
اتنی جھلک دکھا کہ ہو تابِ نظر مجھے

ہیبت سوا ہے شام سے صبح فراق کی
خاموش شمع ہو گئی دے کر خبر مجھے

دنیا بدل گئی جو کھلی بند ہو کے آنکھ
آئینۂ ازل ہے یہاں ہر سحر مجھے

بازو بنا دے پاؤں کو اے ہمتِ بلند
تا آشیاں پہنچنا ہے بے بال پر مجھے

اے آرزوؔ وہ عہد شکن اور وفا کا قول
سچ ہی سہی یقین نہیں آتا مگر مجھے

(۱۱۲)

دل جسے دیتا ملا کوئی نہ اس قابل مجھے
پھر اُسی کو دے نہ دوں جس نے دیا ہے دل مجھے

تو ہی اے تکلیفِ ضبطِ آہ کر بسمل مجھے
ہے زباں بیکار اور کہنا ہے حالِ دل مجھے

بحرِ الفت کے شناور ڈوب کر ہوتے ہیں پار
موج جب اُٹھی نظر آنے لگا ساحل مجھے

جاں کنی کے بعد تربت بعدِ تربت دشتِ حشر
پا شکستہ ہو کے جانا ہے کئی منزل مجھے

دلربائی تو نے سیکھی ہے تو دلداری بھی سیکھ
رازِ الفت فاش ہو اتنا نہ کر بے دل مجھے

ناز برداری میں ننگ و نام کی پروا کسے
ویسا ہی بننا پڑا سمجھے وہ جس قابل مجھے

روکنا دل کی امنگیں جبر تو گزرا ضرور
آگیا آسان کر لینا ہر ایک مشکل مجھے

اہلِ ہمت غیر کے ہوتے نہیں منت پذیر
دم بخود ہے دیکھ کر خنجر بکفِ قاتل مجھے

امتحان عشق میں ہے ہر ادا صبر آزما
ڈر یہ ہے سیدھی نظر بھی کر نہ دے بسمل مجھے

زلزلوں سے حسن کی دنیا ہلا دوں تو سہی
جاتے جاتے کام اپنا دے چلا ہے دل مجھے

میں نے مانا کشتنی تھا دل مگر اپنا تو تھا
وائے مجبوری کہ خود بننا پڑا قاتل مجھے

راز پوشِ غم کی رسوائی میں بھی ہے شانِ راز
تک رہی ہے ٹکٹکی باندھے بھری محفل مجھے

عقل کا چکر تھا خالی پھیر رستے کا نہ تھا
لی جدھر کی راہ پیش آئی وہی منزل مجھے

اک نیا دوزخ بنا کر جھونک دے یہ سب قبول
جن سے تو ناراض ہے ان میں نہ کر شامل مجھے

غیرتِ شاہی ہے یہ اپنی فقیری آرزو
دل کے استغنا سے سب کچھ ہو گیا حاصل مجھے

(۱۱۳)

کر قدرِ عطا دل سے کہ تلخی بھی مزا دے
نعمت وہی نعمت ہے جو بے مانگے خدا دے

ٹکڑے ابھی جڑ سکتے ہیں ٹوٹے ہوئے دل کے
شیشہ یہ پگھل جائے گا تو ہاتھ لگا دے

اے بادِ سحر سوئے چمن جانے سے پہلے
سوتے ہوئے دیوانے کی زنجیر ہلا دے

کم راہبرِ کامل سے نہیں راہِ طلب میں
افتاد وہ افتاد کہ منزل کا پتا دے

اے جلوۂ نیرنگ یہ ہے کون سا انصاف
جس رنگ پہ ہم مٹنے لگیں اس کو مٹا دے

آئینِ تعین سے ہے درویش کو کیا کام
کہنا ہے تجھی سے وہ کسی در پہ صدا دے

اک فردِ جرائم ہوں میں اے آبِ ندامت
احسان ہے ہر طرح ڈبو دے کہ بہا دے

دل کیف کا طالب ہے مگر جذب سے معذور
اب توڑ کے اس جام کو آئینہ بنا دے

آسان سہی دردِ محبت کا مداوا
اس واسطے نعمت یہ نہیں ہے کہ گنوا دے

اس چھیڑ سے کیا فائدہ اے دردِ جدائی
میں بند کروں آنکھ کو تو نیند اُڑا دے

ہوش آتے ہی اقرارِ ازل بھول گیا ہوں
پھر کوئی اشارہ کہ جو دیوانہ بنا دے

ضد چھوڑ دے رکھ شرم مری بزمِ عزا کی
جو خود سے اُمنڈ آئے ہیں یہ اشک بہا دے

دلِ آرزو اتنا تو ہو پابندِ تحمّل
پتھر سے بھی ٹکرا کے نہ ٹوٹے نہ صدا دے

(۱۱۴)

ہنس ہنس کے جو ہر بات کو افسانہ بنا دے
وہ تو جسے چاہے اسے دیوانہ بنا دے

روداد وہ میں کس کو سناؤں جسے تقدیر
اک نیند اُڑاتا ہوا افسانہ بنا دے

ہے شمع جلائے ہوئے پروانے کے دل میں
وہ سوز کہ خود شمع کو پروانہ بنا دے

اب تک تو معین نہیں کچھ حسن کا معیار
یہ دل جسے چاہے اُسے دیوانہ بنا دے

زاہد وہ اُن آنکھوں کی ٹپکتی ہوئی مستی
پتھر میں گڑھا ڈال کے پیمانہ بنا دے

دلچسپ نہیں چشم تحیر کے حجابات
اب آئنہ خانے کو پری خانہ بنا دے

ہوش آتے ہی برپا ہوے اندیشوں کے طوفاں
اس سے تو پھر اچھا ہے کہ دیوانہ بنا دے

نیرنگ نہ دکھلائے اگر جلوۂ یک رنگ
وہ کون ہے کعبے کو جو بتخانہ بنا دے

پردے سے جھلکتا ہوا وہ حسنِ نظر سوز
ڈرتا ہوں کہ جلوے ہی کو پروانہ بنا دے

سالک میں ہوں وہ رند کہ پھسلے بھی اگر پاؤں
اک مسلک نو لغزشِ مستانہ بنا دے

آوارہ ہوئی نکہت گل پھاڑ کے دامن
ایسی بھی خوشی کیا کہ جو دیوانہ بنا دے

ہے آرزو اک خلوتِ دیرینہ کا پیغام
وہ جذب کہ اپنے سے بھی بیگانہ بنا دے

(۱۱۵)

زیب ہے جو چاہے تو اے گیسو پہ خم کرے
آپ ہی پھانسی چڑھائے آپ ہی ماتم کرے

اشک ریزی جوشِ گریہ کو مٹا سکتی ہے کیا
بہتا چشمہ کم نہ ہوگا لاکھ پانی کم کرے

عارضی غوغا فقط ہے پیش و پس کا امتیاز
ورنہ مرنے کو سبھی ہیں کون کس کا غم کرے

اک محبت دو کرشمے پھر کرشمے بھی عجیب
آگ سینے میں جلائے آنکھ کو پُر نم کرے

آرزو تکمیلِ وحشت میں کمی ہے مان لو
دیکھ کر صورت اگر آہوئے صحرا رم کرے

(۱۱۶)

میں ہوں تیرا خلوتیِ ازل ، مجھے کام منظرِ عام سے
سرِ بام جلوہ ہے ضَو فگن ، نظر آ گئے رفعتِ بام سے
وہ پلٹ کے جلد نہ آئیں گے ، یہ عیاں ہے طرزِ خرام سے
کوئی گردش ایسی بھی اے فلک ، جو ملا دے صبح کو شام سے
نہ قفس نصیب نہ آشیاں ، ہے میانِ برزخِ این و آں

ابھی پر شکستہ ہے مرغِ جاں ، کہ پھڑک کے نکلا ہے دام سے
مجھے جس حسیں نے لُبھا لیا ، مرے حسنِ ظن میں وہ بت نہ تھا
اُسے دل نہ دوں تو کروں میں کیا ، جو طلب کرے ترے نام سے
ابھی سوزِ دل ابھی رنگ رو ، جو لگی تھی ایک مقام سے
جو کوئی کسی کا ہے مبتلا ، تجھے اُس سے کیا مجھے اس سے کیا
مرے دل کا قصّہ مجھے سُنا ، میں چھکوں گا اپنے ہی جام سے
اسے کیا کہوں کہ ہے رشتہ کیا ، رگِ شوق سے دمِ تیغ کا
جو لہو نے کی حرکت ذرا ، خود اُگل پڑے گی نیام سے
مجھے رہنے کو وہ ملا ہے گھر ، کہ جو آفتوں کی ہے رہ گزر
تمھیں خاکساروں کی کیا خبر ، کبھی نیچے اُترے ہو بام سے
وہ حریصِ بادہ ہوں ساقیا ، مرے دل میں جذب ہے میکدہ
اگر امتحان ہو ظرف کا ، خُم انڈل پڑے ابھی جام سے
جو ترے عمل کا چراغ ہے ، وہی بے محل ہے تو داغ ہے
نہ جلا کے بیٹھ اسے صبح سے ، نہ بجھا کے سو اسے شام سے
اگر آرزو دل امنڈ پڑے ، تو پھر اشک روکے سے کیا رکے
کوئی مے نہیں کہ اُبل چلے ، تو پلٹ لو شیشے میں جام سے

(۱۱۷)

اور کیا چاہتی ہے جنبشِ مژگاں ہم سے
طالبِ نشترِ غم خود ہے رگِ جاں ہم سے

وہ بھی اک وقت تھا جب قید سے گھبراتی تھی روح
اب یہ دھڑکا ہے کہ چھٹ جائے نہ زنداں ہم سے

اک جھٹکے میں کہیں جوشِ جنوں ہوتا ہے ختم
چھٹنے والا نہیں پھٹ کر بھی گریباں ہم سے

عہد نامہ ہے یہ اُن کا کہ مصیبت نامہ
خود نہیں کہہ کے کہلواتے ہیں وہ ہاں ہم سے

یہ تو بات اُن کے سمجھنے کی ہے اے غیرتِ عشق
ہم کہیں کیوں نہ اُٹھے گا غمِ ہجراں ہم سے

پردہ دیکھیں گے پھر اے شوخیٔ پنہاں تیرا
مل گئے دو بھی اگر چاک گریباں ہم سے

جانے کیا دیر میں بھی ہے وہی کعبے والا
جاتے دیکھیں تو ہوں بدظن یہ مسلماں ہم سے

آرزو ہم تو اشاروں پہ چلیں آنکھوں کے
جب کوئی کام بھی لے گردشِ دوراں ہم سے

(۱۱۸)

اشکوں نے راہ بدلی۔ ضبطِ دلِ حزیں سے
ٹپکا لہو جگر کا۔ بن کر عرقِ جبیں سے

جوشِ نموئے گل میں۔ اعجاز ہے جنوں کا
نکلیں گے ہاتھ سَو سَو۔ ایک ایک آستیں سے

راہِ طلب کی سختی۔ سنگِ نشاں تھی گویا
ٹھوکر پہ کھائی ٹھوکر۔ پلٹا نہیں کہیں سے

خود انفعال مجرم۔ درمانِ سوزِ غم ہے
سینے پہ مل رہا ہوں۔ لے کر عرق جبیں سے

رُخ کا مرے تغیّر۔ غم کی کتاب سمجھو
لی ٹھنڈی سانس جس کا۔ اُلٹا ورق وہیں سے

دل کیا ہے اک امانت۔ ہم اک امین یعنی
دنیا بھی ہے تمھیں کو۔ لینا بھی ہے تمھیں سے

میرے ہی آنسوؤں سے دھو ڈالو خون میرا
دامن سے کچھ نچوڑو، کچھ لے لو آستیں سے

شوقِ طلب نے کھویا۔ حکمِ طلب نے ڈھونڈا
میں گم ہوا تھا جس جا۔ پھر مل گیا وہیں سے

قطع رہِ وفا کے۔ آداب کچھ نہ پوچھو
جو کام پاؤں کا تھا۔ لینا پڑا جبیں سے
میعاد قید پوری۔ دو کروٹوں میں ہو گی
جانا بھی ہے زمیں میں، اُٹھنا بھی ہے زمیں سے
آئی رہِ طلب میں۔ حدِ ادب کی منزل
لے پاؤں کانپ اُٹھے۔ چل سر کے بل یہیں سے
کھا کر قسم وفا کی۔ عہدِ وفا نہ لینا
ہاں چوک ہو گئی کچھ۔ اے آرزو ہمیں سے

(۱۱۹)

یہ تکرار اچھی نہیں نکتہ چیں سے
نکل آے گا ہاں کا مطلب نہیں سے
تعب ضبطِ گریہ کا پوچھ اس حزیں سے
جو آنکھوں کا پانی بہا دے جبیں سے
بٹھایا ہے امیدِ فردا نے جس جا
نئے حشر اُٹھیں گے روز اس زمیں سے
مرا مدعا کیا صدا تیری سُننا
غرض ہے نہ ہاں سے نہ مطلب نہیں سے

جلا غم سے جو دل، بہا ہو کے پانی
بجھی بھی اِس جا لگی بھی یہیں سے

لکیریں تھیں میرے ہی ماتھے کی وہ بھی
جو پھوٹیں شکن بن کے اُن کی جبیں سے

رسائی کے جادے ہیں سورج کی کرنیں
پہنچنا وہیں ہے چلیں ہم کہیں سے

ازل سے ہوں پروردۂ جوشِ وحشت
علاقہ نہیں ہاتھ کو آستیں سے

ترے صدقے ضد شوق کی رکھنے والے
بدلنے لگا وہم باطل یقیں سے

ندامت کے اشکوں کی آنکھیں نہیں ہے
ٹپکنے نہ دو کوئی قطرہ جبیں سے

شعاعوں سے پھٹتے ہی دامن نظر کا
فلک تک تھے جلوے ہی جلوے زمیں سے

فنائے دوئی سے حد شوق میری
جہاں مل گئے وہ یں گم تھا وہیں سے

دل آرزو مجرمِ شوق کیوں ہے پرکھ سیکھی نظروں نے حسن حسیں سے

(۱۲۰)

وحشت نہیں دنیا کو جفا کار سمجھ کے
حق کہتا ہوں اپنے کو سردار سمجھ کے

بے وجہ نظر سوز نہیں حسن کی گرمی
پردہ ہے یہ اک طالب دیدار سمجھ کے

ہر چیز کی اس عالم فانی میں ہے اک عمر
خوش ہوں ترے انکار کو اقرار سمجھ کے

ٹھہرا ہوں ترے کوچہ میں گو سر پہ ہے سورج
امید کا سایہ پسِ دیوار سمجھ کے

زنجیر نفس توڑ کے آزاد ہوئی روح
پیسا تھا زمانے نے گرفتار سمجھ کے

وقت اس کا معین ہے ضرورت ہے مجھے آج
دل ٹوٹ گیا موت کو بیکار سمجھ کے

ہے راہ کڑی روح کو منزل کی ہے جلدی
پشتارۂ تن پھینکا ہے بے کار سمجھ کے

ہوگا نہ کوئی آرزو ایسا بھی نکما
کھاتا نہیں غم بھی جسے مردار سمجھ کے

(۱۲۱)

جمع ہوئے ہیں کچھ حسین۔ گرد مرے مزار کے
پھول کہاں سے کھل گئے۔ دن تو نہ تھے بہار کے

رنگ نہ پوچھ باغباں دہر فریب کار کے
پیچھے تبر خزاں کے ہیں۔ آگے شجر بہار کے

پستی ہمّت اور شے۔ بے بسی اور چیز ہے
ٹوٹ کے بھی نہ تھک سکے۔ پاؤں امیدوار کے

غفلت موسم شباب۔ تو نے بڑا ستم کیا
اب جو کھلی جھپک کے آنکھ۔ ختم تھے دن بہار کے

کام جو بن پڑے تو خیر۔ گر نہ بنے خدا پہ چھوڑ
دل میں ہیں جتنے حوصلے۔ سب نہیں اختیار کے

کی ہے لگی کی تو نے آج۔ صورت شمع اختیار
لائی ہے پھل وفا مری' پھول نہیں مزار کے

منہ پہ تو اُن کے بھی ہنسی۔ کھنچ گئی دل سے ٹھنڈی سانس
اے لو ہوا سنک چلی۔ آگئے دن بہار کے

دست خزاں دراز تھا۔ دیدہ امتیاز کور
پھول بھی خار وخس کے ساتھ پھینک دیے بہار کے

دل کی تڑپ سے آرزو کانپ رہا ہے تن بدن
مجکو قرار آئے کیا۔ بس میں ہوں بے قرار کے

(۱۲۲)

جاتے کہاں ہیں آپ نظر دل سے موڑ کے
تصویر نکلی پڑتی ہے آئینہ توڑ کے

پردہ عبث ہے دیدہ بے اِمتیاز سے
آیا ہوں جلوہ گاہ میں آنکھوں کو پھوڑ کے

طاقت کہاں نفس میں کہ روکے جنوں کا زور
دیوانہ بھاگا جاتا ہے زنجیر توڑ کے

اللہ رے زورِ ناز کہ نازک سی اُنگلیاں
دل مجھ سے چھین لے گئیں پنجہ مڑوڑ کے

نالاں خود اپنے دل سے ہوں درباں کو کیا کہوں
جیسے بٹھا گیا ہے کوئی پاؤں توڑ کے

حرص حصول جاہ کی شانِ جفا ہے اور
رکھ دیں پھلے درخت کو جس طرح جھوڑ کے

کیا جانے ٹپکے آنکھ سے کس وقت خونِ دل
آنسو گرا رہا ہوں جگہ چھوڑ چھوڑ کے

شیشہ ہے دل کا چور تو کیا غم ہے آرزو
منھ اُن کا دیکھ لیتا ہوں ٹکڑوں کو جوڑ کے

(۱۲۳)

جوانی ہے بڑھیں حد سے نہ آگے حوصلے دل کے
دھندلکے ہیں نشاں نظروں سے پوشیدہ ہیں منزل کے

انھیں دار و رسن والوں سے رہنا ہے یہاں مل کے
بنے گونگا چھپا سکتا نہ ہو گر بھید کو دل کے

عدم سے آ گیا اِس بھیس میں کیا کوئی دیوانہ
ہوا ہے بند اور پردے اُڑے جاتے ہیں محمل کے

حدِ شوق آ چکی پھر اضطرابِ شوق باقی ہے
پلٹ جاتا ہے دیوانہ قریب آ آ کے منزل کے

جگہ سے ہٹ رہا ہے یا تلاش جائے مرقد ہے
ارادے کون سمجھے کروٹیں لینے میں بسمل کے

کہاں ہیں ہاشمی اے آرزو پہلے بہت ڈھونڈا
پھریں مایوس جب نظریں تو ٹکڑے ہو گئے دل کے

ہ منشی سید التفات رسول صاحب ہاشمی مرحوم تعلقدار جلال پور رئیس سندیلہ شاگرد مصنف ۱۲

(۱۲۴)

بیانِ حال ہیں نقشے بدلتی چتوں کے
بگڑ رہی ہے مری بات آج بن بن کے

مری قضا ترے بس کی نہ تھی مگر قاتل
ستمگری کے ہیں شاہد نشان گردن کے

بھلے دن آئے تو آزار بن گیا آرامِ
قفس کے تنکے بھی کام آگئے نشیمن کے

عجب طلسم ہے نیرنگِ ہستیٔ موہوم
ہمیشہ مٹتے ہی رہتے ہیں نقش بن بن کے

نظر بچا کے جو آنسو کئے تھے میں نے پاک
خبر نہ تھی یہی دھبے بنیں گے دامن کے

ہے نکتہ رس کے لئے خود سکوت شرحِ سکوت
زبان ہونے پہ بیٹھا ہوں بے زباں بن کے

لگے گی دل میں کبھی دل کے ولولوں ہی سے آگ
لئے ہیں مادہ برق دانے خرمن کے

تعلقاتِ چمن قطع کر رہی ہے صبا
قفس پہ گرتے ہیں تنکے مرے نشیمن کے

رفو سے داغ بنا رازِ پردہ پوشی کا
کھچے نہ چاک گریباں میں تارِ دامن کے

مٹا کے پھر جو بنانے پر اب نہیں قابو
وہ سر جھکائے کھڑے ہیں قریب مدفن کے

سنو گے اِس کے سوا آرزوؔ کلیم سے کیا؟
کہ آنکھ جھپکی تھی سائے میں نخلِ ایمن کے

(۱۲۵)

غمِ دل کو کیونکر۔ نہ فسانہ جانے
وہ جفا کا خوگر۔ کہ وفا نہ جانے

مرا جی جو اُڈا۔ اُمنڈ آیا بادل
رہے یوں ہی کب تک۔ یہ فضا نہ جانے

کوئی کام دل کا۔ جو بنے تو کیونکر
میں طلب نہ جانوں۔ وہ عطا نہ جانے

ترے منہ کے صدقے۔ یہ بتا پیا جی
وہ کدھر کو جائے۔ جو پتا نہ جانے

مری زندگی ہے۔ اب اسی کے بس میں
کہ بنا کے روگی۔ جو دوا نہ جانے

جو ملا ہے مجھ کو وہ دیا ہے کس نے
ہو عطا تو یوں ہو کہ گدا نہ جانے

ترا کلمہ او بُت ابھی دل سے پڑھ لوں
یہ اگر ہو ممکن کہ خدا نہ جانے

یہ امانت اک ہے کہ جو سونپ دی ہے
کبھی اپنے دل کو اپنا نہ جانے

یہ ہو خو تو بیشک دل آرزو ہے
وہ کرے بدی اور یہ بُرا نہ جانے

(١٢٦)

اُف رے ذوقِ خود نمائی چاک سب پردے ہوئے
آرسی ٹوٹی تو اک جلوہ کے سو جلوے ہوئے

---

(١٢٧)

ظاہر وہ نہیں پھر بھی ہر جا نظر آتا ہے
پردے کے ادھر ہی سے کیا کیا نظر آتا ہے

رستے میں رہے سالکِ منزل یہ ہو سرگشتہ
اس دشت کا ہر جادہ الٹا نظر آتا ہے

کیا اس میں بھی پردے ہیں یعقوبؑ کی آنکھوں کے
کیوں دل کو ہر آئینہ اندھا نظر آتا ہے

دیکھا ہے جسے دل نے اس جلوے کو دل جانے
آنکھوں کو تو پردہ ہی پردہ نظر آتا ہے

کیا برق تجلّے بھی اک پردے کی شوخی تھی
جھپکی ہوئی آنکھوں کو دھوکا نظر آتا ہے

اس گریۂ وحشت کو دیکھو مری آنکھوں سے
ہر قطرہ میں خاک اڑتا صحرا نظر آتا ہے

جو دیکھ لے یہ جانے ہے رحم کا اک پتلا
کاش ایسا ہی تو ہوتا جیسا نظر آتا ہے

ہے آرزوؔ آنکھوں میں وہ کچھ نہیں اور سب کچھ
جب دیکھ نہیں سکتے کیا کیا نظر آتا ہے

(۱۲۸)

ہر اک نیرنگ سے ظاہر جمالِ یار ہوتا ہے
یہ پردہ دم بہ دم ہوتا ہے اور بیکار ہوتا ہے

اسی پر منحصر ہے دہر کی ہنگامہ آرائی
کوئی آزار کش کوئی غریب آزار ہوتا ہے

نہ مانو میرے کہنے کو، کلیم طور سے پوچھو
حجاب اٹھنے پہ بھی حاصل کہاں دیدار ہوتا ہے

زمانہ کروٹیں لینے پہ بھی غافل رہا ہم سے
کہ جس کی نیند بھر لیتی ہے وہ ہشیار ہوتا ہے

اسی پردے میں خودبینی بھی ہے اور خودنمائی بھی
انھیں ہردم نیا اک آئینہ درکار ہوتا ہے

اُٹھا کرتے ہیں دل ہی سے ہوا و حرص کے طوفاں
جو خود کشتی ڈبو دے اس کا بیڑا پار ہوتا ہے

جتاتی رہتی ہے نظارہ سوزی اسکے جلوے کی
کہ ساری عمر میں بس ایک ہی دیدار ہوتا ہے

ہمیں اک روز یہ بھی دیکھنا ہے آرزو مرکر
کہ خوش ہوتا ہے کون اور کون ماتم دار ہوتا ہے

(۱۲۹)

الٹ جانے سے دل کے انقلاب عام ہوتا ہے
نظر میں صبح کا تارا چراغِ شام ہوتا ہے

یہ ہے دارِ محن اس سے سکونِ دل کو کیا نسبت
کمی ہونے سے بےچینی کا نام آرام ہوتا ہے

زمانہ جب بدل جائے تو ناز ان کے نہ کیوں بدلیں
نئے ہوتے ہیں پیغمبر نیا پیغام ہوتا ہے
کہاں تک ہے یہاں سے عشق کی ہمت شکن منزل
وہ کیا سمجھیں جنہیں پہلا ہی زینہ بام ہوتا ہے
بنا کر خوگرِ ایذا جفا سے ہے پشیمانی
وہی کرنا انھیں دل جس سے بے آرام ہوتا ہے
مگر راہ طلب میں زندگی کو اور کچھ کہئے
اجل بھی ہو تو عمرِ جاودانی نام ہوتا ہے
جمالِ تام حصہ ہے فقط عاشق مزاجوں کا
جو پہچانا نہیں جاتا وہ جلوہ عام ہوتا ہے
حیات نو ہے پنہاں خلق کی مردہ پسندی میں
نشاں جس وقت مٹتا ہے تو پیدا نام ہوتا ہے
وہ کوئی بات خود اسے آرزو ہم سے نہیں کہتے
زبانی اور کی ہوتا ہے جو پیغام ہوتا ہے

(۱۳۰)

کڑی چوٹیں اٹھانے پر بھی دل مسرور رہتا ہے
اسے کیا توڑتے ہو؟ خود جو شیشہ چور رہتا ہے

تلاش آوارہ ہی رکھتی ہے منزل ناشناسوں کو
جو اس کو دور سمجھے ہیں وہ ان سے دور رہتا ہے
سحر تک شام بن جاتی ہے غم کی مشک پاشی سے
کہیں کافور ایسے وقت میں کافور رہتا ہے
محبت عقل ہی کھو دے تو پھر پابندیاں کیسی
حدِ انسانیت تک آدمی مجبور رہتا ہے
اثر ہے جذبِ منزل کا یہ از خود رفتگی میری
چلا ہوں اس سے ملنے کو جو مجھ سے دور رہتا ہے
دہن اک زخم ہے دنیا کی کافر ماجرائی سے
کہ کھسیانی ہنسی ہنستا ہے اور رنجور رہتا ہے
فریب دید ہائے شوق کے سامان بہتیرے
یہ تاریکی وہیں تک ہے جہاں تک نور رہتا ہے
بنا لے اپنی مرضی جو تری مرضی کو او ظالم
وہ کر سکتا تو ہے سب کچھ مگر مجبور رہتا ہے
جب آنکھیں ڈھونڈھنے لگتی ہیں آتی ہے صدا دل سے
وہ جنت ہے اُدھر جس میں وہ رشکِ حور رہتا ہے

تقرب کا ہے مژدہ ہر کڑی منزل کا طے ہونا
بڑھے غم جس قدر اتنا ہی دل مسرور ہوتا ہے

وفائے عہد پر بھر شہادت بھی ضروری ہے
فدا اس زخم دل کے بن کے جو ناسور رہتا ہے

خودی نے ایک کو دو کر کے یہ تفریق ڈالی ہے
وہ اچھا ہے جو اپنے سے ہمیشہ دور رہتا ہے

سمجھ لے دار پہ چڑھنے کو جو معراجِ حق گوئی
وہی ہر معرکہ میں آرزو منصور رہتا ہے

(۱۳۱)

کسی نے نہ ٹوکا ستانا بُرا ہے ۔۔۔ بُرے تم نہیں ہو زمانہ بُرا ہے
یہ بے رنج کا رنج سہنے سے حاصل ۔۔۔ بری بات کا یاد آنا بُرا ہے
بس اے جوشِ گریہ کہ جاتی ہیں آنکھیں ۔۔۔ یہ آنسو میں لالی کا آنا بُرا ہے
اُکھڑنے پہ بھی پاؤں ہمت نہ ٹوٹے ۔۔۔ رہِ شوق میں بیٹھ جانا بُرا ہے
کہیں شرم پر ہو نہ شوخی کی تہمت ۔۔۔ دکھا کر جھلک منھ چھپانا بُرا ہے
اسی میں ہزاروں ہی گھر پھنک گئے ہیں ۔۔۔ لگانا بُرا ہے بجھانا بُرا ہے

نہ کہئے بُرا آپ تو آرزو کو
وہ ہے آپ ہی کا یہ مانا بُرا ہے

(۱۳۲)

سب کہتے ہیں غافل اُسے وہ محوِ جفا ہے
پھیرے ہے نظر یعنی ادھر دیکھ رہا ہے

جو ہے خلشِ جاں وہ تمنا ہی مٹادیں
ہاں ہے تو دوا یہ بھی مگر تلخ دوا ہے

بے تابیِ دل ہی پہ ہے حبِّ زیست کی بنیاد
آرام تو دنیا میں ملے گا نہ ملا ہے

فولاد ہی پر گرتی ہے کیوں برق کڑک کر
کیا یہ بھی کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے

سُکھ اس کو دُکھوں میں ہے تو بے چینیوں میں چین
کچھ ہے جو حقیقت میں تو دل کون بلا ہے

رُکتا ہوں تو منزل کی تھکن دیتی ہے آواز
او ڈھونڈھنے والے تجھے اپنا بھی پتا ہے

چھینا تھا چھلکتا ہوا جام اُس نے جھٹک کر
کیا مفت کا دھبّہ مرے دامن میں لگا ہے

خو اپنی پشیمانِ ستم بدلے گا کیونکر
ہوگا وہی پھر آرزوؔ اب تک جو ہوا ہے

(۱۳۳)

کیوں وادیِ ایمن کے پھیرے۔ کیوں طور کا آنا جانا ہے
وہ شمع ہے دل ہی میں روشن جس شمع کا دل پروانا ہے

بیٹھے ہو کدھر اے دل والو متوالی نظر سے خود کہہ دو
رُخ تیر کا چاہے جدھر بھی ہو ہر جانب زد پہ نشانا ہے

یا وہ کہ میں کوئی غیر نہ تھا یا یہ کہ بنا ہوں بیگانہ
اُس کا بھی ایک زمانہ تھا۔ اس کا بھی ایک زمانا ہے

اب دل ہی کو ہوش میں لے آئے یا اپنے ہوش بھی کھو بیٹھے
دیوانے بنیں تو کام چلے دیوانے کو سمجھانا ہے

دانائی پر بھی ہے نادانی مانا کہ یہ آگ ہے وہ پانی
ہر شئے کی حقیقت تو جانی اپنے کو بھی پہچانا ہے

کچھ عشق نے ایسی مت پلٹی دل کیا اُلٹا قسمت اُلٹی
ہر کام ہے اب تو ایسا ہی خود کرنا خود پچھتانا ہے

غمخوار انساں پتھر تو نہ تھا، کیا صبر ہی کا ثمرہ ہے جفا
دُکھ جھیل کے اتنا جان لیا۔ کتنا بے درد زمانا ہے

ہی سوزِ دروں سے دل روشن کیوں غیر کی آگ اپنا دامن
ذی ہوش ہے تو دیوانہ نہ بن، انسان ہے یا پروانا ہے

اشکوں سے بھی تسکیں ہوتی تھی، نالوں سے بھی تسکیں ہوگی
چھینٹوں سے بجھے یا لوکوں سے، ہم کو تو پیاس بجھانا ہے
شعلے کی لپک پر شک جو ہوا جس نے دیکھا اُس نے ٹوکا
اے جلنے والے یہ تو بتا تو شمع ہے یا پروانا ہے
کیسی الٹی دنیا ہے بسی، ان شہرِ خموشاں والوں کی
اندر اندر ہے آبادی، باہر باہر ویرانا ہے
ایمان وفا میں شک تھا اسے ہم کھینچ کے قشقہ بیٹھ گئے
اللہ گناہ معاف کرے، کلمہ کافر کو پڑھانا ہے
پیری کا یہ جوش اک دھوکا ہے ظاہر کیا ہے باطن کیا ہے
دل شمع سحر کا شعلہ ہے بجھنے کے لئے لہرانا ہے
یوں اس نے سنا گویا نہ سنا جیسے شکوہ کسی اور کا تھا
انجان بنے بیٹھے رہنا، سو حیلوں کا ایک بہانا ہے
اس کوچے میں اک شیشہ تھا پڑا، ٹھوکر جو لگی ماتھا ٹھنکا
کھوئے ہوئے دل کو پہچانا، اور وہ بھی کب پہچانا ہے
الفت ہو تو محویت بھی ہو، ٹوکو نہ اناالحق والے کو
جو دیکھ سکے فرقِ من و تو، ہشیار رہے یا دیوانا ہے

اے آرزو اتنا سمجھ رکھو۔ اپنا سا نہ دل سب کا جانو
نازک شیشہ ہے بچائے رہو، یہ بے دردوں کا زمانا ہے

(۱۳۴)

کیوں اُس کی یہ دلجوئی۔ دل جس کا دُکھانا ہے
ٹھہرا کے نشانے کو۔ کیا تیر لگانا ہے

غم کو بھی خوشی کر کے، الفت میں دکھانا ہے
ہنس دینے سے جو نکلے۔ آنسو وہ بہانا ہے

اب میری خموشی بھی۔ پر درد فسانا ہے
یعنی وہ نہیں سنتا۔ غم جس کو سنانا ہے

کہتی ہے یہ نیرنگی۔ اک عمر ہے ہر شے کی
ہئیت کی ہے تبدیلی۔ آنا ہے نہ جانا ہے

ہاں بے خودی اک پردہ۔ ہر آنکھ نہیں محرم
پوشیدہ ہے جو دل میں۔ باہر اُسے آنا ہے

مجبور خود اُٹھنے سے۔ طاقت کا تو یہ عالم
اُٹھے نہ دو عالم سے۔ وہ بار اٹھانا ہے

ہے ان کے کرم کی بھی۔ بنیاد ستم ہی پر
اک دل کی خوشی کرنا۔ اک دل کا دکھانا ہے

اندازِ تغافل پر دل چوٹ تو کھا بیٹھا
اب ان کی نشانی کو۔ اُن سے بھی چھپانا ہے
کم طاقتیِ نالہ۔ اشکوں سے مدد لے لے
بے ربط کہانی میں پیوند لگانا ہے
الفت کا چوٹیلہ دل۔ خود حسن کی ہے دنیا
آئینہ جہاں ٹوٹا۔ پھر آئینہ خانا ہے
غم دل کا خدا رکھے۔ اشکوں میں کمی کیوں ہو
شعلوں کی ضمانت میں۔ پانی کا خزانا ہے
بلبل کا حق اے گلچیں جب تک نہ ادا ہووے
ہر پھول سے دامن میں اک داغ لگانا ہے
جینے سے تو بیزاری۔ اے آرزو اور جینا
اب سانس کا لینا بھی۔ اک تیر ہی کھانا ہے

(۱۳۵)

یہ ہستی ایک چکر بھر کا تھوڑا سا زمانا ہے
کہ جس منزل سے اُٹھے ہیں اسی منزل پر آنا ہے
تدارک کر کے دُنیا کی ہوائے ناموافق کا
ہمیں دل کے چراغِ کشتہ کو پھر سے جلانا ہے

کسی جا گرد میں موتی کہیں ہے گرد موتی میں
تری راہوں کو اے تقدیر ہم نے خوب چھانا ہے
کشاکش میں حیات و موت کی ہوں سانس کیا ٹھہرے
یہ بے چینی کی گھبراہٹ ہے آنا ہے نہ جانا ہے
مجھے بس چھوڑ میرے حال پر اے شرمِ رسوائی
وہ دامن چاک کر بیٹھا ہوں جس سے منہ چھپانا ہے
جب اک منزل پہ پہنچے پیش آ ئی دوسری منزل
تلاشِ دوست کی سرگشتگی کا کیا ٹھکانا ہے
اُمنگوں سے بھرا دل ہے ہوا میں شمع کا شعلہ
زباں قابو سے باہر اور حالِ دل سُنانا ہے
جوانی ہے تو دل دیوانے پن سے بچ نہیں سکتا
اثر اتنا ہی مہلک ہے سماں جتنا سہانا ہے
زبانِ آرزو اور ماجرائے عشق کیا کہنا
فقط بے قدر اس سے ہے کہ یہ جھگڑا پرانا ہے

(۱۳۶)

جو شب کو صبح بننا ہے تو دن کو شام ہونا ہے
یہاں کیا کچھ نہیں اے گردشِ ایام ہونا ہے

غبار اُٹھتا ہے یہ کہتا ہوا گور غریباں سے
جہاں میں ایک دن سب کا یہی انجام ہونا ہے

اثر ممکن مگر اس سوچ میں نالہ نہیں کھنچتا
مرے ہاتھوں زمانے بھر کو بے آرام ہونا ہے

پیامِ شوق، اقرارِ وفا، سامانِ نشاط افزا
یہ سب ہونا تو ناممکن مگر بدنام ہونا ہے

مرا روزِ جُدائی بڑھ کے ہے روزِ قیامت سے
وہاں دن بھر کی آفت ہے یہاں پھر شام ہونا ہے

مزے لیں کیوں نہ آزادی کے فرصت دے قضا جب تک
پھر آخر اک نہ اک دن تو اسیرِ دام ہونا ہے

رہے ہر پھر کے میخانے کی حد میں خاک میکش کی
اسی کو شیشہ بننا ہے اسی کو جام ہونا ہے

اسی شہرِ خموشاں میں جہاں چھایا ہے سناٹا
کسی دن حشر جاگ اُٹھے گا وہ کہرام ہونا ہے

بُھلاوے عارضی ناکامیوں کے آرزو کب تک
رہے گا دیکھ لینا ہو کے وہ جو کام ہونا ہے

(۱۳۷)

فرقت بھی وصل ہے جو نہ دل بدگماں رہے
جس حال میں بھی ہم تو رہے شادماں رہے
گہ آرزو بنے کبھی دردِ نہاں رہے
القصہ دل میں گھس کے رہے تم جہاں رہے
بن کشتۂ ہوائے محبت مثالِ شمع
ہر بات راز ہے تو نہ منہ میں زباں رہے
ان بن ہے باغباں سے اور باغ سے لگاؤ
گل سے قریں نگاہ سے دور آشیاں رہے
منزل کے جذب خام سے جھوٹی لگا کے آس
ہم ناتوان گردِ پسِ کارواں رہے
حسرت بھری نگاہ ہی بجلی کوئی گرائے
جب ہم نہ رہنے پائے تو کیوں آشیاں رہے
وسعت کو دل کی تنگ نہ کرائے ہجومِ یاس
آخر غریب دردِ محبت کہاں رہے
میں دربدر ہوں اور وہ خوش اس خیال پر
ہے نام کا ہمارے ہی چاہے جہاں رہے

غمِ چشمۂ حیات کی چلتی ہوئی ہے سُوت
جب تک بھی آنکھ آنکھ ہے آنسو رواں رہے
صدقے اُس ایک دل پہ زمانے کی نعمتیں
لاکھوں دکھوں میں گھر کے بھی جو شادماں رہے
الفت میں ثالثی ہی بنا ہے ملال کی
کیونکر دوئی مٹے جو خودی درمیاں رہے
پھر آرزو کو در سے اُٹھا پہلے یہ بتا
آخر غریب جائے کہاں اور کہاں رہے

(۱۳۸)

خبر نہیں کہ یہ دیوانہ پن رہے نہ رہے
گھٹے نہ شانِ جنوں پیرہن رہے نہ رہے
وہ مدعائے دلی ہے یہ ہے فریبِ نظر
رہے بہار الٰہی چمن رہے نہ رہے
حصُول کچھ نہیں دو دن کی پردہ پوشی سے
یہ خاکِ گور سلامت کفن رہے نہ رہے
نفس حیات کا ضامن ہی مگر کب تک
درازدستیِ قیدِ رسن رہے نہ رہے

پھر آئے گی کہ ہے اک چلتی پھرتی چھاؤں بہار
چمن کی خیر ہو رنگِ چمن رہے نہ رہے
چہل پہل سے امیدوں کی ہوئے لطف اندوز
بھری پُری یونہیں یہ انجمن رہے نہ رہے
بدل رہا ہے زمانہ تو آرزو کیا ٹھیک
وطن میں بھی یہ سوادِ وطن رہے نہ رہے

(۱۳۹)

جذبِ نگاہِ شعبدہ گر دیکھتے رہے
دُنیا اُنھیں کی تھی وہ جدھر دیکھتے رہے
پیہم وہ جس نظر سے اِدھر دیکھتے رہے
ہم اُس نظر میں اپنی نظر دیکھتے رہے
ہمت فزائے شوق تھا امید کا فریب
آیا نظر نہ کچھ بھی مگر دیکھتے رہے
دل کی لگی میں ہوش کسے صبح و شام کا
اِک شمع جلتے آٹھ پہر دیکھتے رہے
غم بھی تھا اشک ریز خوشی بھی تھی اشک ریز
تیرے فریب دیدۂ تر دیکھتے رہے

بے جرم التجا وہ سمجھ لیں گے دل کی بات
ہم یوں ہی بار بار اگر دیکھتے رہے

تھا شوقِ دید تابعِ آدابِ بزمِ ناز
یعنی بچا بچا کے نظر دیکھتے رہے

اہلِ قفس کا خوف زدہ شوق کیا کہوں
سوئے چمن سمیٹ کے پر دیکھتے رہے

مولے سے سُن چکے ہیں نظر سوزیٔ جمال
آنکھیں ہی کیوں رہیں گی اگر دیکھتے رہے

ٹوٹے چمک چمک کے ستارے اُمید کے
یہ ایک خواب تا بہ سحر دیکھتے رہے

پردے کی جنبشوں میں بھی لہریں تھیں حسن کی
جو دیکھنا تھا اہلِ نظر دیکھتے رہے

کھلی جو در ہلا کے قفس کا نسیمِ باغ
تا دیر تول تول کے پر دیکھتے رہے

دل کو وہ امتحانِ محبت میں آرزو
پھروں بدل بدل کے نظر دیکھتے رہے

(۱۴۰)

تیر ہے نشتر ہے غم آگیں ہے درد انگیز ہے
ضبط میں ہر سانس مثل آہ معنی خیز ہے

زخم کا پھٹنا تو کوئی پھول کا کھلنا نہیں
غمزدہ وہ ہوں ہنسی تک جس کی درد انگیز ہے

دکھ پرائے درد کا بے درد کو ہوتا نہیں
ہائے نازِ بے نیازی کس قدر خوں ریز ہے

بدگمانی کی نظر جو ہے مجسم انتقام
اک چھری سمجھو چھری بھی وہ جو ہر دم تیز ہے

ساقیا چشم کرم کا وقت ہوگا کون سا
جامِ دل خالی ہے جامِ زندگی لبریز ہے

آنکھ جھپکی تیور آئے ہٹتے ہی چہرے سے زلف
اللہ اللہ دھوپ اس بدلی کی کتنی تیز ہے

دیکھئے ڈھائے مشامِ جاں پہ کیا کیا آفتیں
آرزو وہ گیسوئے پیچاں کہ عنبر بیز ہے

(۱۴۱)

پاؤں کو لغزش ہے لب پر شورِ نوشانوش ہے
جتنی پیمانے میں اب باقی ہے اتنا ہوش ہے
ساقیا حسنِ طلب کی داد ملنا چاہیے
ہے جماہی طالبِ ساغر زباں خاموش ہے
پہلے وہ قسموں پہ قسمیں پرسشِ احوال پر
سن چکا جب مدعائے دل تو اب خاموش ہے

(۱۴۲)

یہ دوئی کب تک جو دل کو سوزِ غم سے لاگ ہے
جل اٹھی ہیزم تو پھر ہیزم نہیں ہے آگ ہے
نغمہائے شوق بہتیرے مگر نالہ مرا
آگ پانی میں لگا دے اس طرح کا راگ ہے
بے خودی اور راز پوشی ضبطِ غم اور عاشقی
لوٹنے والی ہے یہ پھر اڑنے والا کاگ ہے
تا بہ کے روکیں گے جاتی عمر کا تا نفس
ہے بہت منھ زور مرکب اور نازک باگ ہے

ہے بُرا انجام اندھے شوق کا اے محوِ دید
آنکھیں باقی رہ چکیں جب رات دن کی جاگ ہے
دشمنِ موذی بغل ہی میں ہے ہشیار آرزو
خواہشِ دل زہرِ قاتل۔ دل نہیں ہے ناگ ہے

(۱۴۳)

غم سے دل کی زندگی اور غم سراپا آگ ہے
خود سمندر آگ جس کی ساری دنیا آگ ہے
عشق دل میں شعلہ افگن چشمِ تر میں اشک ریز
ایک ہی شے اور کہیں پانی کسی جا آگ ہے
میں کہ جل بجھنے پہ ہوں ظاہر میں تو وہ خاک کا
خاک لیکن وہ کہ جس کا ذرہ ذرا آگ ہے
ہے بقائے عشق کی بنیاد تکمیلِ فنا
راکھ پروانے کی وہ ہے جس میں زندا آگ ہے
عشق بر پابند یاں کیوں جبکہ ہر جائی ہے حسن
وہ بھی کعبہ یہ بھی کعبہ خاک ہے یا آگ ہے

جوششِ دودِ جگر ہے علتِ باران وبرق
کارِ دریا آب ریزی خوئے دریا آگ ہے

انقلابِ حال ہے تکمیلِ جذبِ اشتعال
اب جلانے والا پانی جلنے والا آگ ہے

عشق اپنی منزلوں میں ہے عجب نیرنگ ساز
آنکھ سرتا سر ہے پانی دل سراپا آگ ہے

تو کہاں پہنچا نہیں اے پرتوِ برقِ جمال
ایک کوہ طور کیسا ساری دُنیا آگ ہے

آرزو وارفتگیِ شوق میں کس کو یہ ہوش
گرم ہنگامہ ہے گھر سے تابہ صحرا آگ ہے

(۱۴۴)

حُسن کی دنیا میں جو ہے موردِ الزام ہے
وائے قسمت بد نہیں دل اور پھر بدنام ہے

جھوٹ سچ کو جاگتی آنکھیں پرکھتی جائیں گی
میں کہے جاؤں سحر ہے تو کہے جا شام ہے

خاک کیوں فرہاد چھانے قیس کیوں کاٹے پہاڑ
وہ اُسی سے خوب بن پڑتا ہے جس کا کام ہے

جب نہیں وہ ملتفت ظاہر ہو کیا صبح امید
دل کا ہر نالہ صدائے مرغِ بے ہنگام ہے
درد اچھا ہے کہ درماں زندگی اچھی کہ موت
بھید اس کا پوچھ اُس دل سے کہ بے آرام ہے
اُٹھتے ہی پہلا قدم سر سے لپیٹا ہے کفن
بے خبر آغازِ الفت سے کہ کیا انجام ہے
موت کہتے ہیں جسے ہے وہ سکونِ دردِ عشق
بے قراری دوسرا اس زندگی کا نام ہے
بیخودِ شوق آرزوؔ ہوتے نہیں موقع شناس
بند آنکھوں کو خبر کیا صبح ہے یا شام ہے

(۱۴۵)

آگئی پیری جوانی ختم ہے
صبح ہوتی ہے کہانی ختم ہے
حسرتوں کا دل سے قبضہ اُٹھ گیا
غاصبوں کی حکمرانی ختم ہے

ہوگیا ذوقِ نظارہ خود فنا
یا بہارِ بوستانی ختم ہے
وقت بینش کیفِ خود بینی کہاں
پیاس ہے موجود پانی ختم ہے
بجھ گیا دل ہو گئی گونگی زباں
اگلی پچھلی ہر کہانی ختم ہے
حُسن نے غارتگری کردی تمام
دل کا ذوقِ کامرانی ختم ہے
ماجرائے غم چراغِ صبح کا
ختم اور اپنی زبانی ختم ہے
خستگی کی حد میں ہے آسودگی
بے تسلی نوحہ خوانی ختم ہے
صورتِ یخ بستہ ہے جوشِ گداز
بہتے دریا کی روانی ختم ہے
ذکرِ غم میں لذتِ غم پھر کہاں
اپنے ساتھ اپنی کہانی ختم ہے

آرزو تھا اک اندھیرے کا چراغ
اُس کی بھی اب ضو فشانی ختم ہے

(۱۴۶)

آنکھ جس دن سے لگی ہے آنکھ لگنا جرم ہے
اُس کی ویسی ہی سزا بھی ہوگی جیسا جرم ہے
جب یہاں آنے پہ ہر اک کام اپنا جرم ہے
آئے ہی کیوں تھے جہاں ہیں ہم یہ پہلا جرم ہے
عاشقی تو جرم ہے اور ہاں ہمارا جرم ہے
حسن میں جو دل فریبی ہے وہ کس کا جرم ہے
آنکھ اچانک لڑ گئی تھی نکلی اُف بے اختیار
چشم پوشی جس سے کی جائے یہ ایسا جرم ہے
وہ نظر ناوک نہیں، نشتر نہیں، خنجر نہیں
اس پہ بھی گھائل بنے جو خود یہ اُس کا جرم ہے
سُونت کر تلوار رکھ لے حلق پر ناکام عشق
عمر بھر جی کے ہی جی سکے ہیں تو جینا جرم ہے

راز کہہ گزرا اگر ناواقفِ قانونِ عشق
یہ تو قابل درگزر کے ہے کہ پہلا جرم ہے
اُس سے کیا امیدِ انصاف اتنا بھی سوچے نہ جو
ظلم کرنا جرم ہے یا ظلم سہنا جرم ہے
عشق کہتا ہے لگے آگ اور آنچ اُٹھنے نہ پائے
ہے تمنا فرض اظہارِ تمنا جرم ہے
کہتی ہے رحمت بھروسا کیا نہیں مجھ پر تجھے
یہ جگہ وہ ہے کہ بے جرمی بھی گویا جرم ہے
ہوتے ہی غرقِ ندامت آئی رحمت جوش میں
آرزو بخشش کا بھی آخر سہارا جرم ہے

(۱۴۷)

جو حسرت نزع میں رُخ سے عیاں ہے
یہ بجھتی آگ کا ٹھنڈا دھواں ہے
نفس تک ہجر میں آشوبِ جاں ہے
چھری اک ہے کہ گردن پر رواں ہے

غمِ دل کا تعب رخ سے عیاں ہے
خموشی اہلِ غیرت کی زباں ہے

طلب کر تاب اے بیتابِ دیدار
نہ بند آنکھیں نہ پردہ درمیاں ہے

دکھاؤں حال کیونکر چارہ گر کو
محبت ایک زخمِ بے نشاں ہے

کہے کون آپ کی محفل کو محفل
کہ اپنے حال میں ہے جو جہاں ہے

نہ پوچھیں وہ تو بگڑی بات بن جائے
بیانِ حال کی طاقت کہاں ہے

نظر میں درد بھر دے اے غمِ ہجر
ابھی فریادِ دل کی بے زباں ہے

خوشا یک رنگیٔ نیرنگِ قسمت
خزاں اپنی بہارِ بے خزاں ہے

وہ سب کچھ سن کے بھی کہتے نہیں کچھ
یہ کس بھولے ہوئے کی داستاں ہے

نہ چھیڑو اس ٹپکتے آبلے کو
جو چپ ہے اس کے منھ میں بھی زباں ہے
بتا اتنا تو اے آہ سحر گاہ
یہ دل کی راکھ اڑی ہے یا دھواں ہے
جھجھک بھی تو مٹا او محو دیدار
ابھی ہلکا سا پردہ درمیاں ہے
یہ پتّوں کی نظر بندی کہاں تک
شجر کیسا ہوا پر آشیاں ہے
امید آخری بھی خون سمجھو
مرا قصّہ ہے قاتل کی زباں ہے
تلاش دوست گم کردے یہیں سے
کدھر جاؤں کہ منزل بے نشاں ہے
سر قبر آرزوؔ رویا کرو اب
یہ سب جس کے لئے ہے وہ کہاں ہے

(۱۴۸)

دم بھر بھی نظر ایک مزاج ایک نہیں ہے
کیوں کر کہوں گردش میں فلک ہے کہ زمیں ہے

نقش قدم اُس کا کہ مرا نقش جبیں ہے
اب ایک ہیں دونوں کوئی پہچان نہیں ہے

خلوت کدۂ دل کا بھرم جائے گا اے شوق
آواز نہ دینا کہ یہاں کوئی نہیں ہے

دیدار کہاں اور کہاں حُسن نظر سوز
کیونکر اُسے سمجھائیے جس دل کو یقیں ہے

دو چار لکیریں جو پڑھی بھی نہیں جاتیں
اک کھیل مقدر کا مرا نقش جبیں ہے

ہاں پاس ہمارے بھی ہے اک حُسن کا معیار
تم اتنے ہی پیارے ہو نظر جتنی حسیں ہے

دلبر کہو، دل جو کہو، جو دل کہے کہہ دو
نام اُس کے بہت جس کا کوئی نام نہیں ہے

بے راہنما ڈالا ہے جس راہ پہ دل نے
اتنی ہے خطرناک کہ رہزن بھی نہیں ہے

تربت میں جو تربت ہے تو مدفن میں ہی مدفن
وہ بھی کب اکیلے کی ہے دوگز جو زمیں ہے

جنبش رگ گردن کی صدا دیتی ہے ہر گام
نادان کہاں جاتا ہے مطلوب یہیں ہے

کہہ سکتا ہے کیا راز دلی دم بخودِ عشق
یوں بند ہے شیشہ کہ کہیں سانس نہیں ہے

شدہ آئی ہے پھر بادِ بہاری کو وطن کی
پلٹا ہوا جھونکا نفسِ بازپسیں ہے

بن آرزو انساں کے عوض سنگِ درِ دوست
سجدے سے جو اٹھتی ہی نہیں یہ وہ جبیں ہے

---

(۱۴۹)

اس جرم کی گر سزا نہیں ہے
پھر چھیڑ میں بھی مزا نہیں ہے

کچھ جس میں ترے سوا نہیں ہے
اُس تنگ نظر میں کیا نہیں ہے
نغمے سے ہے سوز نالہ پیدا
موسم تو بدل گیا نہیں ہے
جب پوچھ لو مدعائے دل تم
پھر کوئی بھی مدعا نہیں ہے
تیور بدلو نہ بعد پرسش
اقرارِ خطا خطا نہیں ہے
ہے تہمت غیر جس پہ وہ بھی
تم ہو کوئی دوسرا نہیں ہے
پابند وفائے عہد خود ہوں
بد عہد کا آسرا نہیں ہے
میں ڈھونڈ رہا ہوں ہائے جس کو
دل ہی میں ہے اور پتا نہیں ہے
مل کر بھی وہی ہے بیقراری
ہے درد بھی تو دوا نہیں ہے

دل کو نہ بناؤ مقتلِ ناز
کعبہ ہے یہ کربلا نہیں ہے
مجبور سے بازپرس کیسی
بندہ کوئی خدا نہیں ہے
ہے آرزو آپ اپنا آزار
ہاں تم سے کوئی گلا نہیں ہے

(۱۵۰)

نگار خانہ بنی ہے دنیا، نگار کی کچھ خبر نہیں ہے
جگر جگر کر رہی ہے محفل، چراغ پیشِ نظر نہیں ہے
خیال پر مٹ رہا ہے عالم، جمال پیشِ نظر نہیں ہے
ادھر جو کچھ ہے اُدھر وہ سب کچھ، اُدھر جو کچھ ہے ادھر نہیں ہے

شروعِ الفت میں ٹھنڈی سانسیں ، کمالِ الفت کی منزلیں ہیں
یونہیں برابر ہوا دیئے جا ، یہ آگ ابھی شعلہ ور نہیں ہے

یہ جام سو مرتبہ جو ٹوٹے ، مئے مسرت کبھی نہ چھلکے
ہے ظرفِ دل عشق کی کرامت ، یہ صنعتِ کاسہ گر نہیں ہے

وہ ایسے غافل نہیں کہ سوچیں ، جو کچھ کیا تھا بجا کئے جا
ہم ایسے کافر نہیں کہ سمجھیں ، انھیں ہماری خبر نہیں ہے

یہ بات تو فہم سے ہے باہر ، کہ جبر ہی جبر ہے سراسر
گزر ہوا اس مکاں میں کیونکر ، کسی طرف جس میں در نہیں ہے

نہ سمجھو اس کو سنی سنائی ، یہ بات ہے اپنی آنکھوں دیکھی
نظر پیامی ہے دردِ دل کی ، زبان پیغامبر نہیں ہے

ہم اپنا ظرف آج آزمائیں ، وہ آرزو بجلیاں گرائیں
ابھی سے کیونکر یہ مان جائیں ، کہ ہم کو تابِ نظر نہیں ہے

(۱۵۱)

یکساں ہیں شب و روز جب آرام نہیں ہے
اپنے لئے ہے صبح فقط شام نہیں ہے
خوں روؤں نہ کیوں دل کی خلش خام نہیں ہے
کانٹا نکل آنے پہ بھی آرام نہیں ہے
مرتا ہوں اس انداز پہ بے موت کہ جس میں
شیوہ تو اجل کا ہے اجل نام نہیں ہے
وہ جوہرِ شمشیر ادا دیکھ رہے ہیں
کیا کس پہ بنی اس سے کوئی کام نہیں ہے
ہوتی ہے کہیں درد کی شدت میں تڑپ کم
اس کو بھی تھکن جان لو آرام نہیں ہے
تقدیر میں ناکامِ محبت کی ازل سے
آغاز ہی آغاز ہے انجام نہیں ہے
تکمیل ہنر دیتی ہے عزت کا نیا نام
وہ بھی کوئی عاشق ہے جو بدنام نہیں ہے

کیا عشق کی کاہش کا گلا جب ہے یہ معلوم
آرام کی تحصیل میں آرام نہیں ہے
بے خوف لگا تیر یہ تیرا او نگہِ ناز
سو خون بھی ہو جائیں تو الزام نہیں ہے
ہے آرزوؔ اب کارگہِ عشق میں دن ختم
آرام سے سو جاؤ کہ کچھ کام نہیں ہے

---

(۱۵۲)

راز اب رہ نہیں سکتا ہے جو کچھ راز میں ہے
خود ہے افسانۂ غم درد جو آواز میں ہے
زندگی عشق کے انجام سے ہے کوسوں دور
دیکھتا ہوں کہ مزا موت کا آغاز میں ہے
روح پرور ہے غضب شوقِ نشیمن کی ہوا
ایک اُکھڑا ہوا پر دیر سے پرواز میں ہے
زد پہ جو آکے بچے کوفت نے مارا اُن کو
خون ہی خون تری صید گہِ ناز میں ہے

گم ہے اندیشۂ حسرت میں وہ چھوٹا ہوا تیر
کہ دل صید نہ دستِ قدر انداز میں ہے

ناتواں آہ سے سوز مزے پیدا ہوں گے
کپکپی اُتری ہوئی تار کی آواز میں ہے

ہنسنا رونا ہے چھیڑ پہ تیری موقوف
نغمہ سننا ہو کہ نالہ سب اسی ساز میں ہے

آرزوؔ کثرت نیرنگ پہ بھٹکے نہ نگاہ
وہ نئی شان سے ہر جلوہ گہ ناز میں ہے

(۱۵۴)

ہو نظر باز تو پھر کچھ بھی نہیں راز میں ہے
خود نیاز سر عاجز کی جھلک ناز میں ہے

درد کا دل کے اثر نالۂ غماز میں ہے
کھا گیا چوٹ کھنک شیشے کی آواز میں ہے

کچھ عجب بات مرے ضبط سخن ساز میں ہے
شُکر اب ہو کہ گلہ ایک ہی انداز میں ہے

وقت میں شک ہے مگر موت پہ ہے اطمینان
ہے یہ وہ تیر کہ دستِ قدر انداز میں ہے

بگڑی قسمت کے بھلاوے ہیں یہ تقدیر کے پھیر
حد سے ٹکرا کے جو پلٹا وہ پھر آغاز میں ہے

بن گئے سیکڑوں قصّے مری خاموشی کے
اور جو راز کی تھی بات وہ پھر راز میں ہے

پھڑپھڑانے سے قفس ٹوٹتا جاتا ہے تو کیا
گھٹتی جاتی ہے جو طاقت پرِ پرواز میں ہے

شرحِ غم آہ نہیں اس پہ بھی اے دل والو
جتنا کچھ ہے سب اسی کانپتی آواز میں ہے

راکھ بھی تو نہیں اس طرح جلے پروانے
شمع ہی شمع بس اب انجمن ناز میں ہے

میرے گونجے ہوئے نغموں کا اثر عالم میں
کچھ نہ ہونے پہ بھی اتنا ہے کہ ہر ساز میں ہے

تیر بیکار ہوا ٹوٹ چکی کھنچ کے کمال
اب وہ سب زور نگاہِ قدر انداز میں ہے

آرزو خوے کرم بھی ہے عجب ظلم نواز
وہی مرغوب اُسے درد جس آواز میں ہے

---

(۱۵۴)

درسِ فنا ستم زدہ دل کے قلق میں ہے
جو خاتمے پہ ہوتا تھا پہلے سبق میں ہے
داغِ ریا سے پاک ہے میری جبین صاف
یہ سرنوشت بھی اسی سادے ورق میں ہے
ہے دشمنوں کا ربط عناصر کا اختلاط
بنیادِ ابتری اسی نظم و نسق میں ہے
تھک کر خجل ہوئے ہیں رہِ مُدعا میں ہم
کُل فکر کا نچوڑ جبیں کے عرق میں ہے
شاداب میرے دم سے ہیں ہستی کی منزلیں
قطرہ وہ ہوں کہ جس کی تری ہر طبق میں ہے
معراجِ عشق جبکہ ہے دار و رسن کے ساتھ
ڈر کس کا آرزو تمھیں اظہارِ حق میں ہے

(۱۵۵)

بہتے آنسو کیا تھمیں غم جوش افزا دل میں ہے
جو رہا کرتا ہے طوفانی وہ دریا دل میں ہے

اس سے باہر کچھ نہ پاؤ گے جو نقشا دل میں ہے
جس کے ایسے سیکڑوں خاکے وہ دنیا دل میں ہے

شرح ہے جو دفتروں کی پوچھتے ہو تم وہ بات
ختم ہے قصہ جو کہہ دوں یہ تمنا دل میں ہے

تن اِدھر احرام میں ہے جاں اُدھر محوِ طواف
ایک کعبے میں ہوں خود میں ایک کعبا دل میں ہے

جس کا شوق دید مجھ کو وہ حریفِ مدعا
کب ہوا سے اڑنے والا ہے جو پردا دل میں ہے

سُرخ دامن حسرتوں کے ہونگے اپنے خون سے
حدِ امکاں سے ہے باہر جو ارادا دل میں ہے

خوئے بے تابی سے اُن کی بے نیازی کو ہے ضد
اپنی دشمن آپ ہے ایسی تمنا دل میں ہے

عکسِ حُسنِ شُوخ جس کے ناز عالم آفریں
ساری دُنیا میں نہ اتنا ہوگا جتنا دل میں ہے
ڈھا رہا ہے آرزو دن رات لاکھوں آفتیں
ہائے وہ ارمان جو آفت کا مارا دل میں ہے

---

(۱۵٦)

چاک کر وہ جیب سے پہلے جو پردا دل میں ہے
پھر یہ صحرا بھول جائے ایسا صحرا دل میں ہے
سیدھا رستہ عشق کا ہے اُلٹا جادہ حُسن کا
آنکھ سے وہ ہو چکا اوجھل تو گویا دل میں ہے
آپ کے انکار پر بھی حُسنِ ظن جاتا نہیں
جو ابھی مرنے نہ دے گا وہ سہارا دل میں ہے
شکوہ ہے کفرانِ نعمت پھر ہو شکوہ کس طرح
یہ ہے خاص اُن کی عنایت درد جتنا دل میں ہے
کاوشِ جامہ دری اے شوقِ باطل کس لئے
چاک کر دینے کا تو وہ ہے جو پردا دل میں ہے

چونک اے محو تماشا کھا رہا ہے کیوں فریب
آنکھ ہے محروم جس سے ایسی دنیا دل میں ہے
تھک کے جب مایوس پلٹی حد سے ٹکرا کر نگاہ
آئی آواز آ اِدھر آ چھپنے والا دل میں ہے
ذائقہ عاجز، زباں نا آشنا ہے آرزوؔ
اُس کی لذت کیا بتاؤں درد کیسا دل میں ہے

(۱۵۷)

کیا ہنسیں بولیں کہیں درد محبت دل میں ہے
چھیڑنے کو یادِ خلوت ساتھ ہر محفل میں ہے
صفحہ دردِ نہاں کی سطر ہے ایک اِک شکن
ہاں مرے ماتھے پہ لکھا ہے جو میرے دل میں ہے
ہیں سبق آموزِ عالم واقعاتِ زندگی
وہ چراغِ کشتہ ہوں جس کی ضیا محفل میں ہے
ظرف کو چھلکا دیا شیشے میں کھا کر مے نے جوش
ٹپکی پڑتی ہے وہ آنکھوں سے جو حسرت دل میں ہے

آفتِ ہوش و خرد ہیں دہر کی دلچسپیاں
جس سے شمعیں بجھ رہی ہیں وہ ہوا محفل میں ہے

کچھ نہیں حاجت کماں کی گر نشانے میں ہو جذب
جو ترے ترکش میں تھا وہ تیر میرے دل میں ہے

درد اک دیتا ہے لاتا ہے دوا اک آرزو
آدمی کس کس طرح کا اس بھری محفل میں ہے

---

(۱۵۸)

میں نے نہیں بھی کب کہا، گر یہ کہا نہیں کہ ہے
پوچھ نہ حال دردِ دل، ہوش بجا نہیں کہ ہے

میں تو نہ کچھ سمجھ سکا، جبر کہ اختیار تھا
پوچھنے والے خود بتا، میری خطا نہیں کہ ہے

پرسشِ دل کے بعد بھی، حالتِ دل ہے گو مگو
پھیر کے منہ وہ ہنس دئے، اور یہ کہا نہیں کہ ہے

کھا گئی کس کی بد نظر ، دل کی نہیں کوئی خبر
ڈھونڈیئے کس اُمید پر ، یہ بھی پتا نہیں کہ ہے
ہے پسِ عرضِ مدعا ، طرزِ سکوت کا گلا
عقدہ یہ حل نہ ہو سکا ، اس میں وفا نہیں کہ ہے
رُک تو گئی وہ ہائے وائے ، چوٹ جو پھر اُبھر نہ آئے
آگے جو کچھ خدا دکھائے ، اب تو پتا نہیں کہ ہے
شکوہ نہ سُن نہ خوف کھا ، ظلم پہ ظلم ڈھائے جا
اتنا بتا دے بے وفا ، تیرے خدا نہیں کہ ہے
چارہ گرِ فراق کی ، اُف رے کرشمہ سازیاں
گم ہوا داغ بن کے درد ، شبہ رہا نہیں کہ ہے
بیٹھے تھے وہ تو چین تھا ، اُٹھتے ہی اُن کے درد اُٹھا
آئی کہاں سے یہ بلا ، وہم بھی تھا نہیں کہ ہے
زخم بھی تیرِ ناز کا ، رازِ وفا سے کچھ نہ تھا
پھیر کے دل دکھا دیا ، منہ سے کہا نہیں کہ ہے

پاس سے اس کے اُٹھ گیا ، خود اُسے ڈھونڈتا ہوا
شوق تھا یا جنون تھا ، ہوش رہا نہیں کہ ہے
مرکے جو کوئی پھر جئے ، آرزو اُس سے پوچھئے
دردِ فراقِ یار کی ، کوئی دوا نہیں کہ ہے

(۱۵۹)

اُن پہ قابو ہو اگر دل کی تمنا یہ ہے
دل بھی قابو سے نکل جائے نتیجا یہ ہے
حسرت مردہ میں جاں آ نہیں سکتی ہرچند
یہی کیا کم ہے کہ جینے کا سہارا یہ ہے
دل کی آزار رسانی کا نہ پوچھو احوال
تم سے ہونا ہے جو کچھ اُس کا نمونا یہ ہے

دل سے نقش اپنا مٹانے میں ہو کیوں اُن کو دریغ
خون تو روئے گا وہ جس کی تمنّا یہ ہے

شاہدِ تجربۂ تلخ ہے ظرفِ منصور
راز مخفی نہ کہیں فاش ہو پردا یہ ہے

دھو دیا تیغ سے بھی ایک وفادار کا خوں
جو چھڑائے سے نہ چھوٹے گا وہ دھبا یہ ہے

آرزوؔ قدرِ ہنر بھی کبھی ہوتی ہوگی
ہے یہی وجۂ حسد آج زمانا یہ ہے

---

(۱۶۰)

اپنا نہیں ہے وہ تک ، جو اپنے پاس بھی ہے
تیرا ہی خوف بھی ہے ، تیری ہی آس بھی ہے

باقی ہو شان جس میں ، ڈر اُس کو شان کا ہو
ہم چاک کیا کریں گے ، تن پر لباس بھی ہے
اپنا کبھی گریباں ، دامن کبھی کسی کا
دستِ طلب جنوں میں ، موقع شناس بھی ہے
بے لُطف زندگی ہے ، خطرے کی زندگی بھی
جینے کی آس بھی ہے ، جینے سے یاس بھی ہے
قاتل کا سُرخ چہرہ ، محشر میں وقتِ پرسش
رحم آئے دیکھتے ہی ، اِتنا اُداس بھی ہے
متوالی آنکھوں والے ، ہو اک نظر اِدھر بھی
ساغر بھی ہیں لبالب ، اور ہم کو پیاس بھی ہے
وہ دل کوئی نہ دیکھا ، جس میں جگہ نہ نکلی
نام آرزو یہ اپنا کچھ ہم کو راس بھی ہے

(۱۶۱)

زندگی لائقِ تعزیر نظر آتی ہے
سانس اک گڑتا ہوا تیر نظر آتی ہے

ناتوانی نے کیا گم ترے دیوانے کو
اب تو زنجیر ہی زنجیر نظر آتی ہے

پیچ و خم ہی تو ہے اُس زلفِ گرہ گیر کا حُسن
جس کی تابع مری تقدیر نظر آتی ہے

کرتی ہے کارِ زباں جب وہ بدلتی چتون
آنکھ سے خوبیٔ تقریر نظر آتی ہے

یاد بھی اس کی کرامت سے نہیں ہے خالی
چلتی پھرتی ہوئی تصویر نظر آتی ہے

سوزِ دل پر ہے گماں شمع کا پروانے کو
عشق میں حُسن کی تاثیر نظر آتی ہے

آپ کا نقشِ قدم میرا خطِ پیشانی
ایک ہی ہاتھ کی تحریر نظر آتی ہے

آگیا وقتِ رہائی ترے دیوانے کا
سانس، ٹوٹی ہوئی زنجیر نظر آتی ہے

حُسنِ بے پردہ کا پردہ ہے یہی نیرنگی
ہر جگہ اک نئی تصویر نظر آتی ہے

آرزوؔ خواب بھی وحشی کے ہیں کیا وحشت ناک
کبھی بیڑی کبھی زنجیر نظر آتی ہے

(۱۶۲)

نشۂ مے مانگے کی چیز ، اس کی بھی کوئی ہستی ہے
کیفِ جوانی کیا کہنا ، مستی اپنی مستی ہے
جس کا مارا سانس نہ لے ، وہ یہ ادائے مستی ہے
ہائے رے انگڑائی ظالم ، ایک اک ضربِ دستی ہے
جو ہے وہ اپنے حال میں خوش ، جو ہے وہ غم سے ہے آزاد
عشق کی دنیا بھی کوئی ، متوالوں کی بستی ہے
غم جانے کی خوشی میں بھی ، آنسو نکلے آتے ہیں
کیسی قہر کی ہے بدلی ، کھلتے کھلتے برستی ہے
شوق و ہوس کا فرق سمجھ ، جتنا دل اُتنی حسرت
پیتے پیتے اُبل پڑنا ، کم ظرفی کی پستی ہے

ساری دُنیا بس کی نہیں ، اپنی دُنیا کر دوں نثار
جنسِ وفا اللہ اللہ ، جن داموں ہو سستی ہے

آئے تجھے جس بستی سے ، جانا بھی ہے وہیں پھر کر
ہستی تو ہوتی ہے نیست ، نیستی آخر ہستی ہے

دل کی اُجڑی بستی کو ، بستی ہی کیوں کہتے ہو
ہوگی کبھی گھما گھمی ، اب تو اُداسی برستی ہے

اُٹھتی آنچ کو کون دبائے ، آہ رُکے آنسو بن جائے
غم کی بھبکیں بدلتی آگ ، پانی ہو کے برستی ہے

حُسن آباد کی سرحد سے ، ہم بھی لٹ کر آئے ہیں
آرزوؔ اس کا نام نہ لو ، عیاروں کی بستی ہے

(۱۶۳)

ہیرا بھی ہے دل تو پتھر ہے ۔ یوں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے
ہاں پانی ہو کر بہہ نکلے ، پھر جو قطرہ ہے موتی ہے

سو پلٹے کھائے زمانے نے ، اور دل کا بخت خوشی نہ بنا
کیا موت کی نیند میں قسمت ، جو ایک ہی کروٹ سوتی ہے

وہ نازِ غضب یہ نیاز ستم ، دم بند ہے اور جینا مشکل
چپ ہیں تو ستائے جاتے ہیں ، بولیں تو شکایت ہوتی ہے

غمخوار ہی جب کاوش رکھیں ، راحت کی اُمید کروں کس سے
اب نیند بھی راتوں کو آ کر ، کانٹے آنکھوں میں چبھوتی ہے

اِس فیصلے پر تیرے ظالم رونے کے ہے قابل حالتِ دل
ٹوٹا نہ اگر تو پتھر ہے ، اور چور ہوا تو موتی ہے

الفت میں خموشی پر مہری ، حیرت میں ہیں جو یہ کیا جانیں
پڑتا ہے داغ کلیجے میں ، اور مہر لبوں پر ہوتی ہے

اے آرزو اب ہم چشموں میں ، ہے ظرف کا اُنکے خدا حافظ
جس دل میں جہاں کی نیرنگی ، سب سرد و گرم سموتی ہے

(۱۶۴)

غم دیا ہے کہ مسرّت دی ہے
سب میں اک طرح کی لذت دی ہے

ہنس نہ اتنا کہ خوشی غم ہو جائے
شے ہر اک حسب ضرورت دی ہے

جام چھوٹا سا ہے رشکِ بحرین
دل میں کونین کی وسعت دی ہے

اِس عنایت کو کہوں کیا مالک
دل دیا ہے کہ مصیبت دی ہے
میں کہاں اور کہاں دردِ فراق
کرم اُس کا کہ یہ نعمت دی ہے
ترک پر مجھ کو نہیں ہے قابو
اُس سے کہہ جس نے محبت دی ہے

---

(۱۶۵)

کم التفات یہ بھی شوق دل کو میری ہے
گھنا درخت نہ ہو چھاؤں تو گھنیری ہے
کرم تو سب کے لئے ہے ستم نصیب کہاں
وہی ملی جو پسندیدہ چیز میری ہے
تو آپ سوچ سمجھ لے فقیر کو نہیں یاد
ہوا تھا اور بھی آنا کہ یہ پہلی پھیری ہے

برون پردہ بھی آکر درون پردہ ہیں وہ
حیا نے چار طرف سے قنات گھیری ہے

بُرا کیا جو کہا روسیاہ ہو شبِ غم
چراغ ضو نہیں دیتے ہیں وہ اندھیری ہے

ہے اُلٹی سانس نشاں بازگشت ہستی کا
قضا نے بھاگتے توسن کی باگ پھیری ہے

کلیمِ شوق بنا ہوں بہ اتباعِ کلیم
مآل اپنی نظر اُس پہ یہ دلیری ہے

مذاقِ عشق یہ ہے نکتہ چیں نہ بن ناصح
پسند میری پرکھ میری آنکھ میری ہے

پیامِ مرگ ہے ماہی کو شست کا جھٹکا
ملا کے آنکھ نظر کج ادا نے پھیری ہے

یہ کس سے ہوگا کہ اقبال جُرم خود کر لے
مگر دہن میں ہمارے زبان تیری ہے

جنھیں نظر ہی نہیں آرزوؔ وہ کیا جانیں
خذف سمیٹے ہیں یا موتیوں کی ڈھیری ہے

(۱۶۶)

لیتی ہوئی دستار کو بھی سر سے اُڑی ہے
وہ گرد کہ جو اپنی ہی ٹھوکر سے اُڑی ہے
ہے بہرِ مشامِ طلب اک ذرّہ تعزیر
جو شرم کی خوشبو تری چادر سے اُڑی ہے
مرغانِ قفس آ گئے گلشن میں قفس سے
جھوٹی یہ ہوا ٹوٹے ہوے پر سے اُڑی ہے
پھر خونِ جگر دیدۂ بیداد سے ٹپکا
پھر چھینٹ اسی پگھلے ہوئے پتھر سے اُڑی ہے
سوتوں کو جگاتی ہے مری بادیہ گردی
رکھتے ہی قدم گرد برابر سے اُڑی ہے
غفلت میں ہے وہ جس کے لئے جاگ رہا ہوں
آنکھوں سے نہیں نیند مقدر سے اُڑی ہے
ہر سمت دھواں پھیلا ہے جلتے ہوئے دل کا
ہاں آرزو اس گھر کی خبر گھر سے اُڑی ہے

(۱۶۷)

کیفیت اضطراب کی سی ہے
زندگی موج آب کی سی ہے
رات دن اُن خماری آنکھوں میں
اک ادا نیم خواب کی سی ہے
بات تجھ میں بھی اے ادائے سکوت
لب حاضر جواب کی سی ہے
شب کو بھی میرے داغ سوزاں میں
روشنی آفتاب کی سی ہے
لطف دید آئے کیا کہ شرم میں بھی
شان ہلکی نقاب کی سی ہے
عشق میں کامرانیوں کی بہار
ایک بے اصل خواب کی سی ہے

مضطرب دل تری حیات میں بھی
کوفتِ مرگ شباب کی سی ہے
تشنہ کامانِ حرص کی دنیا
ہے گمرہاں سراب کی سی ہے
نیند سے جاگنے میں چشم حسیں
کھلتی کونپل گلاب کی سی ہے
کیفیت میری ان کی چپ میں بھی
کچھ سوال و جواب کی سی ہے
آرزو عشق میں کسی کی بھی گت
تجھ خدائی خراب کی سی ہے

(۱۶۸)

خاکِ ہاں سوختہ میں رنگِ فغاں باقی ہے
قصہ باقی ابھی سمجھو کہ زباں باقی ہے

دیکھا دیکھا تری شمشیر ادا کا جوہر
اب اگر زخم نہیں ہے تو نشاں باقی ہے

ابھی تمہیدِ غمِ دل پہ یہ اُف اُف کیسی
جس کا ہر لفظ ہے شعلہ وہ بیاں باقی ہے

خاک میں خاک مری ڈھونڈ کے کیا پاؤ گے
اب وہ دل ہی میں ملے گا جو نشاں باقی ہے

آنکھ صیاد سے ملتے ہی اُڑے ہوش و حواس
پر تو ہیں ہمتِ پرواز کہاں باقی ہے

آگ لگنے کو زرا سا ہے شرارہ کافی
جزیہ وحشت کی ہے جتنا خفقاں باقی ہے

بے نشاں خاک میں مل کر بھی نہیں سوختہ جاں
گرم ہو گی وہ جگہ، آگ جہاں باقی ہے

پرسشِ حال پہ کیا شکوہ ہو نا پرسی کا
درد جو لائے تجھے دل میں وہ کہاں باقی ہے

آرزو اب دلِ نالاں میں کہاں تابِ فغاں
ہے تو اُترے ہوئے چلّے کی کماں باقی ہے

(۱۶۹)

دم بخود بیٹھ کے خود جیسے زباں کیلی ہے
سانس کیا لوں کہ ہوا دہر کی زہریلی ہے

صدیوں میں بھی ہوا خشک نہ خونِ ناحق
آج تک کوچۂ قاتل کی زمیں گیلی ہے

اپنے بیمار سے تم دل میں نہ ہونا بدظن
کہنے سننے سے عزیزوں کے دوا پی لی ہے

بن گیا قطرۂ ناچیز ترقی سے گہر
ذات ہے ایک فقط نام کی تبدیلی ہے

لاگ نے جس کی مجھے پھونکا ہے اندر اندر
شمع اُس آگ کی اک ہیئت تمثیلی ہے

سانس ٹوٹے تو رہا جسم سے ہو طائرِ روح
جس سے قائم ہے قفس وہ یہی اک تیلی ہے

مل کے مٹّی تری چوکھٹ کی ہوا خاک ہے پاک
جو لکیر اب مرے ماتھے کی ہے چمکیلی ہے

دل جو لاکھوں بھی پسیں وجہِ خجالت نہیں کچھ
شرم والوں کی نظر آپ ہی شرمیلی ہے

تری چوکھٹ سے جو ٹکرائے یہ کس کا ہے نصیب
سرخ چہرہ ہے خوشی سے کہ جبیں نیلی ہے

پھر اُڑانا ہیں گریباں کے مجھی کو پُرزے
ہاتھ بے کار ابھی تھے کہ قبا ہی لی ہے

قہر ہے عہدِ جوانی کی ہر اک شوخ ادا
جو کلی اس نئے گلشن کی ہے چٹکیلی ہے

آرزو ہوگا یہ مقتل ہی عزا خانہ بھی
شفقی فرش زمیں کا ہے تو چھت نیلی ہے

(۱۷۰)

ہے راہِ ہوس وہ طولانی ، حد جس کی کوئی نہ تمامی ہے
ہر گام خوشی کا سہی پھر بھی ، آخر منزل ناکامی ہے

اس باغ میں آکر ہم کو بھی ، تقدیر ملی ہے قمری کی
بندش بازو میں طاعت کی ، گردن میں طوقِ غلامی ہے

کس درجہ محبت کا اُن کی ، اعزاز ہے دل کی دُنیا میں
نالہ ہے سواری کا ڈنکا ، دھڑکن آمد کی سلامی ہے

آرام میں ہے بے آرامی ، انجامِ ہوس ہے ناکامی
کہتے ہیں جسے مے آشامی ، در اصل وہ خوں آشامی ہے

اب دل ہے نہ دل دینے والا ، نام آج بھی ہے ناکامِ وفا
جو نقش مٹا کر بھی نہ مٹا ، وہ درہم داغ انعامی ہے

مدہوش محبت نام ہوا ، اے آرزو باہوش ترا
یہ ہوش ہے یا بے ہوشی ہے ، یہ نام ہے یا گمنامی ہے

(۱۷۱)

برائے نام یہ نام و نمود نقشِ فانی ہے
وگرنہ موج کیا گرداب کیا جو کچھ ہے پانی ہے

طلسمِ حیرت آگیں ہر حبابِ بحرِ فانی ہے
ہوا کے زور پر قائم چراغِ زندگانی ہے

گدازِ دل کا سرد و گرم پوچھو شمعِ گریاں سے
بھڑک اُٹھے تو شعلہ ہے ٹپک نکلے تو پانی ہے

ذرا کچھ خود ہی سوچ او نقشِ تربت ڈھونڈنے والے
یہ میری بے نشانی کس کی غفلت کی نشانی ہے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہاں دل ڈوبا جاتا ہے
نہ موجیں ہیں نہ طوفاں ہے نہ دریا ہے نہ پانی ہے

جگر کا درد بن کر رہ گیا ہے رازِ اُلفت کا
دکھاؤں اب اُسے بھی کس طرح جس کی نشانی ہے

سُنا دینا مرا دکھ اے نسیمِ آہ گر جانا
یہ اک پیغام چھوٹا سا ہے اور وہ بھی زبانی ہے

چمک بجلی کی کہتی ہے کہ ٹکرائے ہیں دو بادل
وہی قصّہ ہمارا ہے وہی اُن کی کہانی ہے

رضا پر مرنے والے خوب ہیں اس بھید سے واقف
قضا کیا ہے اُسی قاتل ادا کا اسمِ ثانی ہے

مزا ملتا ہے دم دینے میں رونے میں تڑپنے میں
کوئی دیوانگی ہے آرزوؔ یہ یا جوانی ہے

(۱۷۲)

عشق پر آن بان صدقے ہے
دل کی خواہش پہ جان صدقے ہے
دل ہے خود اپنے دولوں پہ نثار
باغ پر باغبان صدقے ہے
ہو فقیری میں کامل استغنا
تو امیری کی شان صدقے ہے
آرزوؔ دل کی ہے عجب بستی
جس پہ سارا جہان صدقے ہے

(۱۷۳)

دل کی بے چینی سے ماتھے پر پسینا آئے ہے
بس بس اے ساقی کہ اب تو جام چھلکا جائے ہے

تجربے سب ہیچ ہیں قانون سب بے کار ہیں
ہر زمانہ اک نیا پیغام لے کر آئے ہے

جس نے تم کو بھی بنا رکھا ہے اپنا ہم نوا
کیوں نہ پوچھو گے کہ وہ کس دل جلے کی ہائے ہے

لوگ غم کہتے ہیں لیکن تم نے کیا رکھا ہے نام
ہے یہی کچھ۔ اندر اندر جو کلیجا کھائے ہے

بھولنے والی نہیں ہیں یہ بدلتی چتونیں
نقشہ بنتا جائے ہے اور دل پہ جمتا جائے ہے

اک زمانہ مر رہا ہے آرزوئے دید میں
وقت سے پہلے مگر پردہ وہ کب سرکائے ہے

اُس سے نبھنا بھی ضروری جس کی یہ شانِ مزاج
کام اپنا خود بگاڑے ظلم مجھ پر ڈھائے ہے

دل جلائے جائیں وہ ہم یہ بھی کہہ سکتے نہیں
ہائے قبل از وقت یہ کھلتی کلی مرجھائے ہے

بعدِ پروانہ یہ کہہ کر شمع گریاں جل بجھی
جو یہاں جیسا کرے ہے ویسا ہی پھل پائے ہے

وہ یہ کہہ سکتے ہیں جن کے کان ہیں اور دل نہیں
آرزو تو اک سُنے قصے کو پھر دُہرائے ہے

(۱۰۴)

کرم لیکن نہ اتنا بھی کہ دل پر بار ہو جائے
وہ جلوہ پردہ ہے جس سے نظر بیکار ہو جائے

جو پھرتے پھرتے پتلی آنکھ اُن سے چار ہو جائے
اجل کو اپنا کام اپنی جگہ دشوار ہو جائے

وہ دل میں فیصلہ جب کر رہے ہوں میری الفت کا
کچھ ایسا ہو کہ یا رب آنکھ اُن سے چار ہو جائے

اِسے وہ کیا کرے پیار آئے گر ذکرِ جفا پر بھی
بہت ناصح نے تو چاہا تھا دل بیزار ہو جائے

تغافل کے سکوں سے بے قراری درد کی اچھی
لگا وہ ٹھوکریں جس سے وفا بیدار ہو جائے

دل اک نازک سی شے ہے زخمِ دل اس سے سوا نازک
نہ چھیڑ اتنا کہ لینا سانس بھی دشوار ہو جائے

مدارِ زندگی جس پر تو اُس اُمید کا دشمن
اب اچھا ہے کہ جینے ہی سے دل بیزار ہو جائے

جنونِ شوق اچھا لیکن اس حد پر نہیں اچھا
کہ انساں آپ اپنا درپئے آزار ہو جائے

کروں کیا جب عداوت ہو چمن کے تنکے تنکے کو
بنا ڈالوں نشیمن کی قفس تیار ہو جائے

وفا کیا میری اور میں کیا مقدم ہے پسند اُنکی
کھٹکتا پھول کانٹا ہے جو دل بیزار ہو جائے

لے لے انسانیت بڑھ حُسن خود آواز دیتا ہے
کوئی ہے جو محبت کا امانت دار ہو جائے

محبت آرزو طوفاں بدامن دل کی یہ کوشش
جہاں ڈوبے تو ڈوبے میری کشتی پار ہو جائے

(۱۷۵)

جس پر اُن کی نگاہ ہو جائے
سانس کھینچے تو آہ ہو جائے

الاماں میرے غم کدے کی شام
سُرخ شعلہ! سیاہ ہو جائے

پاک نکلے وہاں سے کون جہاں
عذر خواہی گناہ ہو جائے

عشق خود جاذبِ نظر ہو کر
حسن کی سیر گاہ ہو جائے

خود میں کھو جاؤں شوقِ منزل میں
ہوش گم کردہ راہ ہو جائے

آسرا ڈھونڈتی ہے مردہ اُمید
اک نظر گاہ گاہ ہو جائے

رنج ہی دیں مگر وہ خوش تو رہیں
کسی صورت نباہ ہو جائے

انتہائے کرم وہ ہے کہ جہاں
بے گناہی گناہ ہو جائے

اُف کشمکش میں بھی اِس بلا کی کشش
کہ جو دیکھے تباہ ہو جائے
چپ ہی کر دے گی رازداریٔ غم
خود نہ گونگا گواہ ہو جائے
کہدوں گر لذتِ جفا تو ابھی
داد گر داد خواہ ہو جائے
گرمیٔ حسن! شوقِ سوز وہ ہے
کہ نظر ہی سیاہ ہو جائے
بچ اُس افراطِ شوق سے جس میں
پاک بازی گناہ ہو جائے
آرزو اُن کی خو نہ بدلے گی
چاہے دُنیا تباہ ہو جائے

(۱۷۶)

ساتھ دنیا میں ازل سے دل مردہ لائے
گرمیٔ بزم کو یہ شمع فسردہ لائے
قطع امید پہ بھی جور سہے ناز اُٹھائے
ایسا دل ایسا کہاں سے کوئی گُردہ لائے

ہیں یہی سردِ نفس سوزِ محبت کا مآل
ساتھ کافور پہ حسرت مردہ لائے
قبرِ ناشاد کی ہے دودِ جگر سے رونق
اہلِ دل لائے بھی تو شمعِ فسردہ لائے

(۱۷۷)

آنسو بہا کے سیکڑوں مطلب ادا کیے
ہم عشق کی زباں میں غمِ دل کہا کیے

اظہارِ مدعا کے لیے آسرا ہے شرط
جب تک وہ دیکھتے رہے آنسو بہا کیے

اخفائے راز، شانِ وفا، امتحانِ صبر
آج ایک خامشی نے بڑے حق ادا کیے

عہدِ وفا قبول مگر یہ جواب دو،
کس حق سے یہ دباؤ ہے بے سامنا کیے

تھا ایک نام ذہن میں اور ہاتھ میں قلم
پوچھو نہ یہ کہ بیٹھے ہوئے کیا کیا کیے

ہے شکوۂ جفا کی جگہ شکرِ التفات
شرمندہ کر رہا ہوں انھیں بے گلا کیے

تھا ... ۔ ۔ ت جان کے رکھ دی قضا نے بات
اچھا ہوا مریض ترا بے دوا کئے

دل کی لگی کے سامنے پانی بھی تیل تھا
جب تک نہ راکھ ہو لیا شعلے اٹھا کئے

آئندہ تم سے چشمِ مروت کی کیا امید
کہنا ہے جو کہیں گے نہ بے سامنا کئے

ہنستے ہو اشک و آہ پہ یہ سوچتے نہیں
کس کس طرح غریب نے مطلب ادا کئے

لذّت شناسِ غم نہ ہوا آرزو وہ دل
مدت گزر گئی جسے درد آشنا کئے

(۱۷۸)

جانچ کرتا ب نظر کو روئے جاناں دیکھئے
دیکھ سکئے کوندتی بجلی تو ہاں ہاں دیکھئے

تیرگی بڑھ لے تو حسنِ ماہِ تاباں دیکھئے
پہلے آنکھیں پھوڑ لے پھر روئے جاناں دیکھئے

گھیر کر پردہ سیہ گل کر کے تاروں کے چراغ
ظلم ڈھانے آ رہی ہے شامِ ہجراں دیکھئے

بے گناہی کشمکش میں پھنس کے بنتی ہے گناہ
پاک نظریں ہوں تو پیراہن چاک داماں دیکھئے

روح کو تھی زیست کی میعاد قفلِ بے کلید
وقت پر خود کھل رہا ہے بابِ زنداں دیکھئے

میں تو نکلا دیر سے روشن لئے دل کا چراغ
کہتے ہیں کافر یہ بد باطن مسلماں دیکھئے

جان کی راحت سے بڑھ کر دو گرہ کپڑا نہیں
دیکھئے اب دل کی الجھن یا گریباں دیکھئے

دل کی آوازِ حزیں کا اب تو ہر شعبہ ہے آہ
اک ذرا اپنے ستم ہائے فراواں دیکھئے

قول جب تک قول ہے قابل بھروسے کے نہیں
مُنھ سے کہنا کیا کبھی دن کر کے احساں دیکھیے

بدگمانی غفلتِ چشمِ یقیں کا ہے وبال
جاگتے رہیے تو کیوں خواب پریشاں دیکھیے

کشمکش میں اجتنابِ حُسن و جوشِ شوق کی
ٹوٹتا ہے ہاتھ یا پھٹتا ہے داماں دیکھیے

آرزوؔ پردہ ہے اپنا آپ نامحرم نگاہ
آنکھ لائق دیکھنے کے ہو تو ہاں ہاں دیکھیے

(۱۷۹)

ڈھونڈتے تجھ کو حرم میں نہ سوئے دیر گئے
راہ ہی چھوڑ دی وہ ہم نے جدھر غیر گئے

چھوٹے چھوٹے سے یہ سر تیز مژہ کے نشتر
آنکھ میں آ کے چُبھے تا بہ جگر پیر گئے

تھا نہاں سرِ حقیقت تہہِ دامانِ مجاز
راہِ شر سے ترے سرگشتۂ سوئے خیر گئے

صدمۂ رشک سے محرومیٔ قسمت بہتر
تا چمن ساتھ صبا کے نہ پئے سیر گئے

آرزو دل تو ہے خوش یادِ صفِ مژگاں سے
نیش رگ رگ میں اگر پیر گئے پیر گئے

(۱۸۰)

سوز و سازِ عشق گرمِ کار ہے میرے لئے
شمعِ غم ہوں خامشی گفتار ہے میرے لئے

عشق اِک بڑھتا ہوا آزار ہے میرے لئے
خود یہ ناکامی معینِ کار ہے میرے لئے

دردِ سر سے کم نہ جانو فکرِ دردِ لا دوا
خود مسیحا میرا اب بیمار ہے میرے لئے

دل کو دیوانہ بنانے والے لیتا جا اِسے
کام کا تیرے ہے اور بے کار ہے میرے لئے

بسکہ طولِ ہجر سے افزوں ہے طولِ انتظار
آپ کا اقرار بھی انکار ہے میرے لئے

وہ ہزاروں خواہشیں جو حدِ امکاں سے بعید
زندگی خود اِک بڑا آزار ہے میرے لئے

دشمنوں کی کیا کمی ہے لے غمخواروں کو ساتھ
قتل کا محضر ابھی تیار ہے میرے لئے

دھوپ سہ لینا ہے اچھا بارِ احساں کون اٹھائے
چھاؤں اک گرتی ہوئی دیوار ہے میرے لئے

حشر کے مجمع سے نکلا ہوں صفوں کو چیرتا
یعنی اُن کا آج کا دربار ہے میرے لئے

آرزو اب میں ہوں اور سیریں دیارِ حسن کی
اجنبیت آپ پردہ دار ہے میرے لئے

(۱۸۱)

عشق کا غم ہے پیامِ موت ہر غم کے لئے
خود سمِ قاتل ہے اور تریاق ہر سم کے لئے
خود مسیحائے زماں ہے غم قتیلِ ناز کا
بخشتا ہے زور شل ہاتھوں میں ماتم کے لئے

---

(۱۸۲)

ہم آج کھائیں گے اک تیر امتحاں کے لئے
کہ وقف کرنا ہے دل نازِ جاں ستاں کے لئے
جلا کے دل کو لپک سے ڈرو نہ شعلے کی
زباں دراز ہے لیکن نہیں فغاں کے لئے

اسی چمن میں کہ وسعت ہے جس کی نامحدود
نہیں پناہ کی جا ایک آشیاں کے لئے

کیا تھا ضبط نے دعوائے رازداریٔ عشق
اٹھا ہے درد کلیجے میں امتحاں کے لئے

کسی کو ڈھونڈے نہ ملتا نظر کی چوٹ کا نیل
نہ ہوتا دل میں سویدا اگر نشاں کے لئے

سوائے دل کے جو سرمایۂ دو عالم ہے
نہ کچھ یہاں کے لئے ہے نہ کچھ وہاں کے لئے

نہ عشق جرم ہے کوئی نہ دل کی بات ہے راز
برا ہو شرم کا اک قفل ہے زباں کے لئے

خلاف اپنے رہی وضع ساز و برگ چمن
قفس بنے ہیں جو تنکے تھے آشیاں کے لئے

لرز رہے ہیں فلک آرزو کہ آہ رسا
چلی ہے تیغ بکف فتح ہفت خواں کے لئے

(۱۸۳)

وہ دیں الزام جھوٹے اور غرض یہ ہو بجا کہیے
غضب ہے ظلم ہے اندھیر ہے کہیے تو کیا کہیے

وفا پر مر مٹے جو آپ اُس کو بے وفا کہیے
یہ دن کو رات کہہ دینا ہے گویا اور کیا کہیے

جو مرتا ہو تو جی اُٹھے نہ مرتا ہو تو مر جائے
اب اس میٹھی نظر کو زہر کہیے یا دوا کہیے

ہمارے قتل ہی کی رائے لی جائے نہ کیوں ہم سے
وہاں تو بس یہ ضد ہے جو وہ فرمائیں بجا کہیے

بدی سے بھی کہاں کوئی کسی کو یاد کرتا ہے
جو کوسے ہاتھ اُٹھا کر اس کو بھی دل سے دعا کہیے

ضروری کام دونوں اور یکجائی بہت تھوڑی
اب اُن کی داستاں سنئے کہ اپنا ماجرا کہیے

بناوٹ سے کسی کی التجا دہرا کے ہنس دینا
جواب اُن کا اِسے کہیے کہ گنبد کی صدا کہیے

بھلائی خود نہ کرنا اور بھلے کو بھی بُرا کہنا
جو ہو ایسی ستم ایجاد اُس دنیا کو کیا کہیے

(۱۸۴)

تضمین جزوی بر غزل میر

یعنی مسدس الارکان اشعار کو ایک ایک جزو کے اضافے سے مثمن بنایا ہے

جان لیوا، غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
آگہی میں، دم کے جانے کا نہایت غم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی، لکھی ہوئی
حرف کیسے، ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

سب کے منہ سے، سنتے ہیں لیلیٰ کا خیمہ تھا سیاہ
کتنے دن تک، اُس میں مجنوں کا مگر ماتم رہا

کودکی سے، حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
تا جوانی، خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

دل نہ پہنچا، دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
بے اثر اک، قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

زندگی بھر، اس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے
مرتے مرتے، اپنے حق میں آبِ حیواں سم رہا

کھل نہ بیٹھیں، جامۂ احرامِ زاہد پر نہ جا
بے بصیرت، تھا حرم میں لیک نا محرم رہا

بے تحاشا، دیکھ میرا رونا اُس نے ہنس دیا
آنکھ جھپکی، برق چمکی ابرِ باراں تھم رہا

بے مروّت، زلفیں کھولے تو تو ٹک آیا نظر
بڑھ کے اُلجھن، عمر بھر یاں کام دل برہم رہا

آرزو بس، صبح بیتی شام ہونے آئی میر
وائے غفلت، تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب
مستعار لی گئی تھی مقررہ مدت سے
زیادہ رکھنے کی صورت میں ایک آنہ
یومیہ لیا جائیگا۔

کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ

ب۔ ۱۔ اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس [illegible]، مجلس انتظامی، مجالس شعبہ جات و نصاب پانچ کتابیں ایک ایک ماہ کیلئے اپنے پاس رکھ سکینگے۔

۲۔ اساتذۂ جامعۂ عثمانیہ و کلیات ملحقہ و گزیٹیڈ عہدہ داران جامعہ اور اراکین دار الترجمہ دس کتابیں ایک ایک ماہ کیلئے اپنے پاس رکھ سکینگے۔

۳۔ طلبائے ایم۔ اے، ال ال بی و تحقیقاتی جماعتوں کے طلبہ تین کتابیں اور بی۔ اے اور انٹرمیڈیٹ کے طلبہ دو کتابیں دو ہفتہ تک اپنے پاس رکھ سکینگے۔

۴۔ مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ ہوں تو طلبہ سے بحساب ایک آنہ یومیہ فی کتاب جرمانہ لیا جائیگا۔

۵۔ بشرط موقع کتابیں گھر جاری کی جا سکینگی مگر اس غرض کیلئے کتب خانہ میں کتاب کا لانا لازم ہے۔

۶۔ کتابیں گم یا خراب ہو جائیں تو تشخیص پر زر [illegible] داری عائد ہوگی۔

۷۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان یا حاشیہ نہیں لگایا جائیگا۔

[illegible]